مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۷ | ربیع الاول ۱۴۳۷ھ | جنوری ۲۰۱۶ء | شمارہ ۱

الصلاح والاصلاح

نیکی کرنا اور دوسروں کو تلقین کرنا

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۲۰ روپے | زرسالانہ =/۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور ۳۵۴۲۲۲۱۳ ۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

الصلاح والاصلاح

نیکی کرنا اور دوسروں کو تلقین کرنا

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	وجہ انتخاب مضمون	۹
۲.....	رحمت خداوندی	۱۰
۳.....	اسلام کی خوبی	۱۱
۴.....	وساوس سے بچنے کا طریقہ	۱۲
۵.....	میلان نفس	۱۳
۶.....	اشکال کا جواب	۱۴
۷.....	قرآن فہمی کی شرط	۱۴
۸.....	نفس کی نگرانی کی ضرورت	۱۵
۹.....	اہمیت ذکر	۱۶
۱۰.....	ذکرِ قلبی	۱۷
۱۱.....	رفع اشکال	۱۸
۱۲.....	اقسام ذکر	۱۹
۱۳.....	جاہل پیر	۲۰
۱۴.....	وہ مقامات جہاں ذکر قلبی درست نہیں	۲۰
۱۵.....	درجاتِ ذکر	۲۱
۱۶.....	بیانِ حکم کی وجوہ	۲۲
۱۷.....	بعض احوال میں ذکر قلبی کے افضل ہونے کی وجہ	۲۲

۱۸.....	وساوس سے بچنے کا طریقہ	۲۴
۱۹.....	شبہ کا جواب	۲۴
۲۰.....	دوسرا شبہ اور اس کا جواب	۲۵
۲۱.....	بیک وقت دو طرف توجہ	۲۷
۲۲.....	مضامین قرآن کی خوبی	۲۷
۲۳.....	الف لام کا بے محل استعمال	۲۸
۲۴.....	علاج کی ضرورت	۲۹
۲۵.....	سالکین کی غلطی	۳۰
۲۶.....	حجابات کے درجات	۳۱
۲۷.....	مجوزہ معمولات کی پابندی	۳۱
۲۸.....	منتہی کا حال	۳۲
۲۹.....	مکالمہ عیسیٰ و یحییٰ علیہم السلام	۳۴
۳۰.....	وجہ انتخاب مضمون	۳۶
۳۱.....	تعمیر مکان میں مأذون درجہ	۳۸
۳۲.....	اسراف کے معنی	۳۸
۳۳.....	تذکرہ دار آخرت	۴۰
۳۴.....	حیات دنیوی کا مذموم درجہ	۴۱
۳۵.....	قرآن وحدیث میں دنیا کا اطلاق	۴۲
۳۶.....	سوال کا جواب	۴۳
۳۷.....	اسباب دنیا	۴۴

۳۸.....	اعمال کی حقیقت	۴۵
۳۹.....	آخرت میں تین لوگوں کا حال	۴۵
۴۰.....	مومن اور کافر کے صدقہ میں فرق	۴۶
۴۱.....	اعمال میں درجہ کمال کے حصول کا طریقہ	۴۷
۴۲.....	کوتاہی اعمال کی ایک قسم	۴۸
۴۳.....	دوسروں کی اصلاح کا اہتمام	۴۹
۴۴.....	تفسیر آیت میں غلط فہمی کا ازالہ	۵۰
۴۵.....	اصلاح غیر کے درجات	۵۱
۴۶.....	کفار سے دوستی کا نقصان	۵۲
۴۷.....	اسلام اخلاق سے پھیلا تلوار سے نہیں	۵۳
۴۸.....	مسلمان ہر حال میں کافر سے بہتر ہے	۵۴
۴۹.....	ہماری اخلاقی پستی	۵۵
۵۰.....	تبلیغ دین کی ضرورت	۵۶
۵۱.....	مبلغین کا کام	۵۷
۵۲.....	کوشش کے درجات	۵۸
۵۳.....	تبلیغ کرنے میں اعتدال کا اہتمام	۵۹
۵۴.....	خوشی کے دو درجے	۶۰
۵۵.....	کوشش کے لئے استطاعت شرط ہے	۶۲
۵۶.....	جاہلانہ سوچ	۶۳
۵۷.....	ہماری ذمہ داری	۶۴

۵۸..... مرتدین کو تبلیغ کرنے کا اہتمام ۶۵
۵۹..... نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ۶۶
۶۰..... تبلیغ کے لئے مبلغین علماء کی جماعتیں بنانے کی ضرورت ۶۷
۶۱..... تربیت ملبغین اوران کی کفالت ۶۷
۶۲..... دو حکایتیں ۶۹
۶۳..... چندہ جمع کرنا علماء کا کام نہیں ۶۹
۶۴..... چندہ جمع کرنے کا طریقہ ۷۰
۶۵..... مبلغین کی کوتاہی ۷۰
۶۶..... چندہ شدہ رقم کی حفاظت اورخرچ میں احتیاط ۷۱
۶۷..... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشورہ ۷۱
۶۸..... حضرت تھانوی کا جواب لاجواب ۷۲
۶۹..... دعاء سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ۷۳

وعظ

الصلاح والاصلاح

نیکی کرنا اور دوسروں کو تلقین کرنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے وعظ ''الصلاح والاصلاح'' ۲۰/ رجب ۱۳۴۱ھ بروز جمعہ بعد نماز مغرب دلدار علی خان کے مکان واقع کرنیل گنج کانپور کے افتتاح کے موقع پر جس کا نام اشرف منزل رکھا گیا تین گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے ضبط فرمایا سامعین کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی جس میں خواتین بھی پردہ میں موجود تھیں۔ موضوع تھا ضرورت تبلیغ اور اشاعت اسلام۔ دنیا کی ملامت اور فکر آخرت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی اصلاح کی فکر کرو۔

وعظ عوام و خواص سب کے لئے انتہائی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۸۔ اگست ۲۰۱۵ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾(۱)

وجہ انتخاب مضمون

ہر چند کہ یہ مضمون جوان آیات میں مذکور ہے کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت میں اس کی ضرورت ہے مگر اس وقت ایک خاص محرک(۲) اس کے بیان کا پایا گیا ہے اس لئے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے وہ محرک(۳) یہ ہے کہ اس وقت ایک دار (یعنی مکان) کی بناء مکمل ہوئی ہے(۴) اور اس آیت میں جو مضمون ہے وہ بھی ایک دار ہی کے متعلق ہے اور اس پر تنبیہ کی(۵) اس لئے ضرورت ہوئی کہ تنبیہ ہمیشہ ایسے ہی امور پر کی جاتی ہے جن کی حاجت ہوتی ہے(۶) اور حاجت کا مدار حالت پر ہوتا ہے یعنی جیسی حالت ہوگی

(۱) سورۃ الانعام: ۳۲ (۲) اس مضمون کو بیان کرنے کا ایک خاص داعیہ پیش آیا (۳) داعیہ (۴) تعمیر مکمل ہوئی (۵) متوجہ کیا (۶) ضرورت۔

ویسی ہی حاجت ہوگی اور حالت مشاہدہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری وہ حالت کیا ہے جس کی اصلاح اور علاج پر تنبیہ کی ضرورت ہے سو وہ حالت یہ ہے کہ ہمارا غیر ضروری امور میں اشتغال غالب ہے(۱) اور اس حالت کا نہایت مضر(۲) ہونا ظاہر ہے کیونکہ جب غیر ضروری امور میں اشتغال ہوگا تو لازم ہے کہ ضروری امور میں لاپرواہی ہوگی اور ضروری امور میں لاپرواہی کا انجام بجز خسارہ(۳) کے اور کیا ہوگا اس آیت میں ہم کو یہی تعلیم کی گئی ہے کہ ضروری امور کی طرف رغبت کرو اور غیر ضروری امور سے زیادہ دل نہ لگاؤ۔

رحمت خداوندی

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی ہم پر کیا رحمت ورافت ہے(۴) کہ ان کو ہر وقت ہماری اصلاح کی طرف توجہ ہے چنانچہ ان آیات میں ہمارے اس مرض کا اور ساتھ ہی ساتھ اسکے علاج کا ذکر کیا گیا ہے اور سبحان اللہ یہ کیسی رحمت ہے کہ صرف غیر ضروری امور پر تنبیہ فرما کر محض اُن سے بچنے ہی کا امر(۵) نہیں فرمادیا بلکہ وہ امور بھی بتادیئے ہیں جن کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ کسی چیز سے بچانا ایک تو یہ ہے کہ مخاطب کو اُس کی ضد کی طرف متوجہ کردیا جاوے۔ اور ایک یہ ہے کہ اُس فعل کی صرف برائی بیان کردی جاوے۔ مثلاً ایک طبیب کسی بد پرہیزی کرنے والے کو جو سنکھیا(۶) کھاتا ہے یا افیون کھاتا ہے یہ بتادے کہ یہ اشیاء نہ کھایا کرو اور یہ نہ بتاوے کہ پھر اُس کے چھوڑنے کے بعد یہ مریض کیا کھاوے تو یہ تعلیم ناقص ہے کامل طبیب وہ ہے جو سنکھیا وافیون(۷) سے ممانعت کرکے کوئی ایسی شئی بتلادے جس میں ضرر تو کچھ نہ ہو اور افیون وسنکھیا کے منافع موجود ہوں

(۱) غیر ضروری کاموں میں زیادہ مشغولیت ہے (۲) نقصان دہ ہونا (۳) سوائے نقصان کے اور کیا ہوگا (۴) رحمت ومہربانی (۵) حکم (۶) زہر (۷) زہر اور بھنگ سے منع کرنے کے بعد۔

چنانچہ یہاں حق تعالیٰ کی یہ رحمت نمایاں ہے کہ اُس بد پرہیزی کی مضرت بتانے کے ساتھ وہ ضروری چیز بھی بتلادی جسے اختیار کرنا چاہئے کیونکہ مصلح کا فرض ہے کہ مضر پر توجہ دلا کر اس کے بعد نافع پر بھی تنبیہ کردے(۱) اس واسطے کہ انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا کرتا وہ کوئی نہ کوئی مشغلہ اپنے واسطے ضرور تلاش کر لیتا ہے اور وہ مشغلہ نافع ہوتا ہے یا مضر۔ یا نہ نافع ہوتا ہے نہ مضر بلکہ عبث (۲) ہوتا ہے اس واسطے کہ عبث اس کو کہتے ہیں جو نہ نافع ہو نہ مضر (۳) یعنی لغو اور مالا یعنی (۴) تو اگر اصلاح میں صرف اسی پر اکتفا کیا جاوے کہ یہ کام نہ کرو یا نہ کھاؤ اور نافع پر تنبیہ نہ کی جاوے یعنی یہ نہ بتایا جاوے کہ پھر کیا کرو اور کیا کھاؤ تو اُس صورت میں بھی ممکن ہے کہ مخاطب اُسی طبعی عادت کے سبب اس مضر چیز کے ترک کے ساتھ کسی لغو میں (۵) مبتلا ہوجاوے پھر اس حالت کا انجام یہ ہوگا کہ پہلے تو وہ عبث و مالا یعنی میں مبتلا ہوگا اور تجربہ کی بناء پر پھر شدہ شدہ (۶) کسی مضر میں مبتلا ہوجائیگا اس لئے ابتلاء بما لا یعنی کا اکثر انجام ابتلاء بما یضرہ (۷) ہی ہوجاتا ہے کیونکہ مالا یعنی شدہ شدہ امر مضر تک پہنچا دیتا ہے۔

اسلام کی خوبی

اسی واسطے رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے: من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (یعنی لایعنی امور کا ترک کردینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے) اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں کہ عبث ولغو کو لایعنی کہتے ہیں یعنی جو چیز نافع ہو نہ مضر وہ لایعنی ہے اسی کے ترک کو حضور نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا۔ من حسن اسلام المرء

(۱) نقصان دہ چیز کے ذکر کرنے کے ساتھ نفع مند چیز کو بھی بیان کرے (۲) بیکار (۳) نہ فائدہ مند ہو نہ نقصان دہ (۴) بیکار محض ہو (۵) اس نقصان دہ چیز کو چھوڑ کر کسی بیکار کام میں مشغول ہوجائے (۶) رفتہ رفتہ (۷) عموما بیکار کام میں مشغولی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ نقصان دہ کام میں مشغول ہوجاتا ہے۔

ترك ما يضره کہ مضر کا ترک کر دینا حسن اسلام سے ہے حالانکہ مضر کا ترک کر دینا یقیناً حسن اسلام ہے مگر حضور نے بجائے مایضرہ کے مالا یعنی (۱) فرما کر یہ بتلا دیا کہ جو عبث ہے وہ واقع میں مضر ہی ہے تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں ایک ارتکاب مضر (۲) اور ایک خلو عن الشغل المفید (۳) اور یہ دوسری قسم اپنے مآل (۴) کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ فقط مضر کا ترک کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائدار ہوگا کیونکہ چند روز تک تو نفس صبر کرتا ہے اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔

وساوس سے بچنے کا طریقہ

چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ تم نفس کو مشغول کر لو قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کر لے۔ یعنی اگر تم نے نفس کو کسی کام میں نہ لگایا تو وہ خود تمہارے لئے کوئی دھندا (۵) نکال لے گا۔ وہ دھندا کیا ہے اولاً وساوس وخطرات (۶) پھر ثانیاً معاصی ومنکرات (۷) اور نفس کی یہ اُدھیڑ بن اُسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ کچھ نہیں کرتا ورنہ کام میں لگ جانے کے بعد خطرات نہیں آتے دیکھئے ایک کارڈ لکھتے وقت کیا حال ہوتا ہے اس وقت تک ایک بھی خطرہ نہیں آویگا۔ تو اس کا راز کیا ہے راز یہ ہے کہ نفس کسی وقت بیکار نہیں رہنے پاتا اگر اس کے لئے کوئی مشغلہ نہ تجویز کیا جاوے تو وہ خود اپنے لئے کوئی شغل تجویز کر لیتا ہے پس کارڈ لکھتے وقت چونکہ اپنے

(۱) نقصان دہ کے بجائے بیکار کا تذکرہ کیا (۲) نقصان دہ کام کو اختیار کرنا (۳) مفید کام میں مشغول نہ ہونا (۴) انجام کے اعتبار سے (۵) کام (۶) پہلے درجہ میں وسوسے اور برے خیالات (۷) دوسرے درجہ میں ارتکاب گناہ ومنہیات۔

نفس کو ایک شغل میں لگا دیا ہے اس لئے کسی اور چیز کی طرف اس کو توجہ نہیں ہوتی اور نماز وغیرہ میں جو وساوس آتے ہیں تو اکثر اسکا سبب یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کو شغل صلوۃ میں نہیں لگاتے ورنہ وساوس ہرگز نہ آئیں یا بہت کم آئیں غرض جب یہ نفس بدون کسی شغل کے چھوڑا جاتا ہے تو یہ خود اپنا کوئی مشغلہ تجویز کر لیتا ہے۔

میلان نفس

اور یہ ظاہر ہے کہ نفس جو مشغلہ اپنے لئے خود تجویز کریگا وہ شر ہی(۱) ہوگا کیونکہ نفس کا اصلی میلان شر ہی کی جانب ہے دلیل اس کی قرآن مجید کی آیت ہے: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾(۲) اس میں حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے قول کی حکایت ہے دیکھئے انہوں نے یوں نہیں فرمایا کہ ان النفس لامارت باالسوء وامارت بالخیر یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر بلکہ یہ بتایا کہ نفس کی ایک ہی قسم ہے کہ وہ امارہ بالسوء ہے یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں یعنی جب خدا کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت اس عارض قوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے بہرحال استثناء سے نفس کی کوئی جداگانہ قسم بتلانا مقصود نہیں ہے بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ان النفس لامارة فی کل وقت الا مارحم ربی وما مصدریة ای وقت رحمته تعالیٰ علیها(۳)۔

---

(۱) برا ہی ہوگا (۲) اور میں نے اپنے نفس کو بے قصور نہیں بتایا بے شک نفس تو برائی کا بڑا حکم دینے والا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ سورۃ یوسف: ۵۳ (۳) نفس ہمیشہ برائی کا حکم کرتا ہے مگر جبکہ اللہ اس پر رحم کرے اس جگہ ما مصدریہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس وقت اللہ کی رحمت اس پر متوجہ ہو اس وقت برائی کا حکم نہیں کرتا۔

اشکال کا جواب

شاید کسی کے ذہن میں یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے کہ ان النفس لامارۃ بالخیر الاما امر بالسوء(۱) تو کیا حرج تھا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنی نہ پیدا ہوتے جو اب ہوئے کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھالیا تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا کھالیا مگر زید وعمرو نے، اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے۔ اور اگر اسی کو یوں تعبیر کریں کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا تو معلوم ہوگیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ نہ بنائیں گے اور اگر نہ کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ بنائیں گے بہرحال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ لامارۃ بالسوء یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اور الامارحم ربی مستثنیٰ ہے اس لئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنانا چاہئے سو قرآن میں ایسا ہی ہے کیونکہ غالب صفت نفس کی امارہ بالسوء ہی ہے۔

قرآن فہمی کی شرط

واقعی قرآن کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ زبان کا بھی ذوق ہو اور عادات ومحاورات میں بھی کامل دخل ہو۔ محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہوسکتا

(۱) نفس بھلائی کا حکم کرتا ہے مگر کبھی برائی کا بھی کرتا ہے۔

بلکہ عرف وعادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہئے ورنہ غلطی ہوجانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے کیونکہ قرآن کا نزول عرف ومحاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

نفس کی نگرانی کی ضرورت

بہرحال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے(۱) اس لئے جب اس کو کسی کام میں نہ لگایا جاوے گا تو یہ اپنے لئے خود مشغلہ تجویز کرلے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لئے تجویز کریگا چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا اس لئے وہ اکثر برا ہی ہوگا اور مضر ہی کو تجویز کریگا اسی واسطے مالا یعنی کے ترک(۲) کو جناب رسول مقبول ﷺ نے حسن اسلام فرمایا کیونکہ مضر کو تو ہر شخص مضر سمجھتا ہی ہے۔ خفا(۳) صرف لا یعنی میں ہے پس مقصود حضور کا یہ ہے کہ مضر کو چھوڑنے کے بعد لا یعنی سے بھی بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے، اس پر کہ مایعنی(۴) میں نفس کو لگاوے پس اُس ترک کے لئے یہ فعل بھی لازم ہے، بہرحال نفس کا میلان الی الشر تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا تو معصیت ہی تجویز کریگا، اور جب یہ بیکار ہوگا تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہوگا۔ تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ ترک مضر کے بعد اشتغال بالنافع(۵) ضروری ہے سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔ اب سوال یہ رہ گیا کہ نفس کو کسی خیر میں ہر وقت کیسے مشغول رکھا جاسکتا ہے جو وہ اس بلا لایعنی یا مضر سے بچے اور وہ کونسا دہندا ہے جس میں ہر وقت لگایا جاسکے کیونکہ جتنے دہندے ہیں ان میں ہر کام موقت ہے(۶) مثلاً کھانا پینا سونا اور نماز اور دوسری عبادات سب موقت ہی ہیں جو

(۱) عموماً نفس برائی کا حکم کرتا ہے (۲) بیکار کام کے چھوڑنے کا حکم دیا (۳) پوشیدگی (۴) کسی کام میں نفس کو لگادے (۵) نقصان دہ کام کے چھوڑنے کے بعد مفید کام میں مشغول ہونا ضروری ہے (۶) ہر کام کا وقت مقرر ہے۔

کام بھی ہے وہ خاص وقت میں ہے تمام اوقات کو کوئی شغل محیط نہیں اور نفس کو بچانے کے لئے ضرورت ہے شغل غیر موقت (۱) کی جو ہر دم ہو سکے کیونکہ اسکا خاصہ یہ ہے کہ جہاں ذرا بھی خالی ہوا وہیں بیہودگی میں مبتلا ہوا، تو وہ کام کونسا ہے جو ہر وقت کیا جا سکے۔

اہمیت ذکر

صاحب! شریعت میں ایک ایسا شغل بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل کام ہے۔ اور بحمداللہ قرآن میں اُسے بھی بتلا دیا گیا ہے وہ کیا ہے وہ ذکر ہے سو نماز، روزہ، حج سب کو تو موقت (۲) بتلایا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں تو توقیت صلوۃ کی تصریح ہے خمس صلوات (۳) اور قرآن میں گو تصریح نہیں مگر اشارہ ہے۔ اور روزہ کو تو قرآن ہی میں موقت کر دیا گیا ہے ایاما معدودات (۴) اور اسی طرح حج میں بھی اشہر معلومات (۵) فرمایا گیا مگر ذکر کو کہیں موقت (۶) نہیں کیا گیا نہ قرآن میں نہ حدیث میں بلکہ ارشاد ہے اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (۷) اور ارشاد ہے واذکر اسم ربك (۸) اگر کوئی کہے کہ ذکر بھی تو موقت ہے دیکھئے قرآن مجید میں اسکا بھی وقت بتایا گیا ہے چنانچہ اذْكُرُوا اللّٰه کے بعد ارشاد ہے سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً۔ یعنی صبح و شام تسبیح کرو۔ جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض بھی محاورہ نہ جاننے ہی سے پیدا ہوا محاورۃً یہ ہے کہ جب ایک جنس کی دونوعوں (۹) کو جمع کیا جاتا ہے تو مراد اُس سے احاطہ واستیعاب اُس جنس کا ہوتا ہے مثلاً یہ کہیں کہ میں نے تلخ وشیریں چکھا ہے اور ابتدا وانتہاء دیکھی ہے اور چھوٹا بڑا مجھے جانتا ہے وغیرہ وغیرہ تو اس سے بالبداہتہ استیعاب (۹) ہی مراد ہوتا ہے اسی طرح یہاں صبح وشام سے بھی یہی مراد ہے کہ

(۱) ایسا کام کہ جس کا وقت مقرر نہ ہو (۲) ہر ایک کا وقت مقرر ہے (۳) دن میں پانچ نمازیں مقرر ہیں (۴) گنتی کے چند دن یہ رمضان کے تیس دن (۵) معلوم مہینے یعنی شوال ذیقعدہ اور ذی الحجہ (۶) ذکر کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں (۷) ذکر اللہ کثرت سے کرو (۸) اپنے رب کا نام لیجئے (۹) قسموں (۱۰) احاطہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

رات دن برابر ذکر کرو یعنی کوئی وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو۔ تو بکرۃ واصیلا کے معنی فی کل وقت ہوئے (۱) اب یہ بات رہ گئی کہ ہر وقت کیسے ذکر ہو تو ہر وقت ذکر ہونے کی صورت یہ ہے کہ محل ذکر میں تعمیم (۲) کی جاوے یعنی خواہ قلب سے ہو خواہ زبان سے ہو سو تعمیم محل کے بعد دوام ممکن ہو گیا۔

ذکرِ قلبی

اور پھر اگر کوئی کہے کہ قلب سے ذکر کے کیا معنی اور کیا اس کا شریعت میں کچھ ثبوت ہے تو میں کہتا ہوں کہ حدیث نے اس اشکال کو بھی صاف کر دیا ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ کان صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل احیانہ کہ آپ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کل احیان میں اوقات بول و براز وقضائے حاجات (۳) بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ بول و براز کے موقع پر زبان سے ذکر و تلاوت مکروہ ہے بس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ اذکروا اللہ میں یا واذکر اسم ربك میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ذکر کے اصل معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرائن (۴) سے اس پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یاد، اب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی البتہ ذکر کا لسانی ہونا (۵) محتاج دلیل ہو گیا اور

(۱) ہر وقت میں (۲) ذکر سے مراد عام ہو چاہے زبان سے یا دل سے (۳) ہر وقت کے عموم میں پیشاب پاخانے کا وقت بھی شامل ہے (۴) شواہد (۵) زبانی ذکر۔

میں نے یہ مضمون خصوصیت سے اس لئے بیان کردیا کہ بعض خشک لوگوں کو ذکر قلبی میں کلام ہے بہرحال یہ ہے وہ کام جو ہر وقت کے کرنے کا ہے اگر زبان تھک جائے تو قلب سے ذکر کرو اور اگر زبان سے بھی برکت حاصل کرنا ہو تو زبان سے بھی کرو بس ان کی یاد ہونی چاہئے پھر خواہ الفاظ کے واسطہ سے ہو خواہ مذکور کے تصور سے۔ مقصود تو یہ ہے کہ غفلت نہ ہو جو طریق تمہیں سہل معلوم ہو اُس طریق سے کرو۔

رفع اشکال

اور ذکر کے متعلق بعض اہل علم کو ایک اور شبہ ہوگیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں لفظ اسم کو زائد کہا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی سہل (۱) توجیہ یہ ہے کہ ذاکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی (۲)۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور، اس لئے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ مبتدی کے لئے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ہے اور منتہی کے لئے وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ہے کیونکہ مبتدی کے لئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اس کی زبان پر آجاوے یا قلب میں یہ نام آجائے۔ ذکر لفظی کی بھی دو صورتیں ہیں ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے ایک ذکر منطوق ہے اور ایک متصور (۳)۔ منطوق تو ظاہر ہے، متصور مثال سے سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی نہ جانتا ہو اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کا دل میں خیال کرے اور زبان سے نہ ادا کرے تو یہ محض الفاظ کا تصور ہوگا۔ اور معنی سے اسے کچھ بھی علاقہ نہ ہوگا کیونکہ وہ معنی ہی نہیں

(۱) آسان توجیہ (۲) جو سلوک و تصوف کے ابتدائی درجہ میں ہو دوسرا جو سلوک کے مراحل طے کرکے انتہائی درجہ میں پہنچ گیا ہو (۳) ایک ذکر وہ ہے جو زبان پر جاری ہے اور ایک ذکر وہ ہے کہ ہر وقت اس کا تصور ہے۔

جانتا اس درجہ کو حدیث النفس اور کلام قلب کہتے ہیں شاعر اسی کو کہتا ہے ۔

ان الکلام لفی الفوأد وانما　　جعل اللسان علی الفوأد دلیلا (۱)

سو الفاظ متخیلہ کا درجہ بھی کلام لفظی ہی کا درجہ ہے (۲) کیونکہ ان میں ترکیب وتعاقب سب کچھ ہوتا ہے بہر حال ذکر ہونا چاہئے۔

اقسام ذکر

اب ذکر کی اقسام چند ہوں گیں۔ ایک لسانی، ایک قلبی، اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں، ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی، اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں (۳) بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے۔ کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع ومواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے (۴) البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے یہ بیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے پس ذکر قلبی ہی اپنی دو قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہوسکتا ہے یہاں تک کہ سونے کے وقت بھی ہوسکتا ہے گو سونے کے بعد نہ ہو سو اُس حالت میں انسان مکلّف ہی نہیں اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہوسکتا کھانے کے وقت بھی ہوسکتا ہے بلکہ بعض وقت یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے مثلاً جہاں ریاء کا شبہ ہو یا ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل

(۱) کلام تو اصل میں دل میں ہوتا ہے اور زبان تو اس دل کی ترجمان ہے (۲) الفاظ کا تخیل وتصور کرنا بھی لفظ کلام کے مترادف ہے (۳) ذکر لسانی بھی ایسا نہیں کہ اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہ ہو بلکہ بعض حالتوں میں اس میں بھی وقت کی قید ہے (۴) جب نیند غالب ہو، پیشاب پاخانہ کرتے وقت اور جماع میں مشغولی کے وقت اور گندگی کے مقام پر زبان سے ذکر کرنا منع ہے۔

ہے۔ مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قراءت میں متعدی(۱) نہ کر لیجئے کیونکہ نماز کی قراءت و تکبیرات و تسبیح و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہوگی ہاں گونگا البتہ معذور ہے اس کی نماز محض تصور ہی سے ہوجاوے گی۔

جاہل پیر

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک بزرگ (صورۃً بزرگ نہ معنیً) قنوج میں تشریف لائے تھے بیچارے نرے جاہل۔ جو لوگ ان کے پاس مرید ہونے آتے اول تعلیم ان کی یہ ہوتی تھی کہ نماز میں قرات دل ہی دل میں پڑھا کرو اور یہ بھی ہدایت کر دیتے تھے کہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ کرنا چنانچہ بہت سے لوگ ان کے بہکانے میں آ گئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے تو وہ نماز نہ پڑھتے تو بہتر ہوتا کیونکہ اپنے کو بے نمازی سمجھتے اور شاید کبھی قضا کر لیتے اور اب تو بیچاروں نے محنت بھی کی اور پھر نماز نہ ہوئی اور نہ قضا کی طرف التفات(۲)۔ بڑی مدت کے بعد کسی ترکیب سے بعضے لوگوں کو اس کا پتہ لگا تو ان کی غلطی پر عام لوگوں کو متنبہ کیا گیا اور ان کو وہاں سے نکالا گیا اسی لئے طریق باطن میں بہت ضرورت ہے شریعت کی ورنہ ممکن ہے کسی کو کوئی یہ رائے دے دے کہ جب ذکر قلبی افضل ہے ذکر لسانی سے تو پھر نماز کو بھی دل میں کیوں نہ پڑھ لیا کریں یاد رکھو اس طرح سے نماز نہ ہوگی۔

وہ مقامات جہاں ذکر قلبی درست نہیں

غرض ذکر قلبی کی فضیلت سے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جہاں احکام دینیہ مثلاً نماز وغیرہ یا احکام دنیویہ مثلاً طلاق نکاح عتاق(۳) وغیرہ کا تعلق ہے کہ یہ امور ذکر

(۱) نماز میں ذکر قلبی نہ شروع کر دینا (۲) نہ قضاء نماز پڑھنے کی طرف توجہ (۳) غلام آزاد کرنا۔

قلب سے صحیح نہیں ہوسکتے مثلاً دل ہی دل میں نکاح کرلے تو نکاح نہیں ہوگا ایسے ہی دل ہی دل میں طلاق دے تو طلاق بھی نہ پڑے گی اور مراد اس سے وہ صورت نہیں کہ چپکے چپکے زبان پر طلاق آ گیا اور اُس سے زبان کو حرکت بھی ہوئی تو مگر کسی نے نہ سنا ہو اس صورت میں تو طلاق پڑ جاوے گی کیونکہ یہ تو تلفظ باللسان ہی ہے گو بالجہر (۱) نہ سہی۔ باقی اگر فقط دل میں طلاق کو سوچ لیا زبان بالکل نہیں ہلی تو اس سے طلاق نہیں پڑے گی کیونکہ یہ عقود تکلم باللسان (۲) کے ساتھ متعلق ہیں پس اُس کی استثناء کے بعد جو اور امور رہ گئے ہیں جن میں تکلم شرط نہیں ہے ان کے متعلق یہ قاعدہ عام ہے کہ وہاں ذکر قلب بھی معتبر ہے بلکہ بعض کے لئے اور بعض جہات سے یہ افضل ہے اور سب سے افضل یہ ہے کہ ذکر قلب اور ذکر لسانی دونوں کو جمع کیا جائے۔

درجاتِ ذکر

اس اعتبار سے ذکر کے تین درجے ہوئے ایک تو وہ جس میں صرف زبان کو حرکت دی جائے اور قلب متوجہ نہ ہو یہ درجہ سب سے کم ہے دوسرا درجہ وہ جس میں زبان کو حرکت نہ دی جائے صرف قلب سے ذکر کیا جائے یہ پہلے درجہ سے بڑھ کر ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کو بھی حرکت دی جائے اور قلب کو بھی متوجہ کیا جائے یہ سب سے بڑھ کر اور افضل ہے لیکن میں یہ پھر کہتا ہوں کہ بعض حالتوں میں دوسرا درجہ تیسرے درجہ سے بھی افضل ہوجاتا ہے یعنی کسی وقت وہ ذکر جو محض قلب سے ہو افضل ہوتا ہے اُس ذکر سے جو قلب و زبان سے ہو، وہ کیسے وہ اس طرح جیسے خود حضور ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے ارشاد ہی سے سیدھا راستہ نظر آتا ہے سو یہ مسئلہ خود حضور اقدس ﷺ نے بتلا دیا

(۱) اگرچہ زور سے نہیں کہا لیکن آہستہ تو ادا کیا (۲) ان معاملات کا تعلق زبان سے ادائیگی پر ہے۔

ہے جیسا عنقریب آتا ہے اور مسئلہ بتلانے کے ساتھ خود حضور ہی نے اس کی حکمت بھی بتادی ہے گو حکمت یا علت کا بتانا حضور کا فرض منصبی نہ تھا آپ کا منصب صرف حکم کا بتلانا ہے مگر آپکا تبرع واحسان ہے کہ کہیں کہیں حکمت بھی نمونہ کے طور پر بتادیتے ہیں جیسے کوئی آقا اپنے نوکر کو کوئی کام بتادے اور نوکر کا تحیر دیکھ کر اُس تجویز کی حکمت بھی بتادے تو گو یہ آقا کا فرض نہ تھا کہ وہ حکمتیں بتادے کیونکہ نوکر کو حکمت سے کیا واسطہ اس کے ذمہ تو تعمیل حکم ہے(۱) اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ نوکر کس بات کا ہے مگر یہ اُس کا تبرع واحسان ہے کہ کسی کام کی اُسے حکمت بھی بتادے۔

بیانِ حکم کی وجوہ

اسی طرح حضور کے ذمہ بھی بیان حکمت لازم نہیں اسی لئے جہاں کہیں آپ نے حکمت بتائی ہے وہ بطور نمونہ کے ہے جس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ ہمارے احکام میں حکمتیں ضرور ہیں چنانچہ دیکھو بعض نمونہ کے طور پر تم کو بتادی گئی ہیں مگر سب حکمتیں تم کو نہیں بتلائی گئیں پس جہاں کوئی حکمت حکم شرعی میں تمہیں نہیں معلوم ہوئی وہاں بھی سمجھ لو کہ حکمت ضرور ہے چنانچہ جن احکام کی حکمتیں حضور نے نہیں بتلائیں ان کو اہل اللہ نے بڑی مقدار تک حل کردیا ہے۔ غرض احکام کا دارومدار حضور کے ارشاد پر ہے چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔

بعض احوال میں ذکر قلبی کے افضل ہونے کی وجہ

بہرحال سرسری نظر میں یہ ایک نیا دعویٰ ہے کہ ذکر قلب بعض اوقات مطلوبیت وافضلیت میں مجموعہ ذکر لسانی وقلبی سے بھی بڑھ کر ہے مگر اس کا مدلول نص ہونا ابھی ظاہر ہوا جاتا ہے سنئے حدیث شریف میں ہے اذا غلب احدکم

(۱) حکم کی بجا آوری۔

النعاس وھو یذکر اللّٰہ فلیرقد او کما قال یعنی حضور فرماتے ہیں کہ جس وقت تک نیند نہ آوے اس وقت تک تو نفلیں تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو۔ فلیرقد امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں لعلہ یستغفر فیسب نفسہ یعنی ممکن ہے کہ وہ قصد تو استغفار کا کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش درست نہیں رہتا لامحالہ کہے گا کچھ، اور نکلے گا کچھ تو شاید دعا کے بدلے بدعا نکلے چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے اللھم اغفرلی کہ اے اللہ مجھے بخشد یجئے تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے اللھم اعفرلی عین مھملہ [1] سے زبان سے نکلے یعنی اے اللہ مجھے تباہ برباد کر دیجئے مٹی میں ملا دیجئے صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے تو یہ حدیث نص ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو زبان سے ذکر نہ کرے پس اس وقت زبان سے ذکر ممنوع [2] ہے اور اس سے پہلے یہ نص گذر چکی ہے کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یذکر اللّٰہ فی کل احیانہ کہ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے اور ہر وقت میں نیند کا وقت بھی داخل ہے اور ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں اس سنت پر ذکر لسانی کے طریق پر عمل نہیں ہوسکتا اس لئے دونوں روایتوں کو یوں جمع کریں گے کہ غلبۂ نیند کے وقت ذکر لسانی کی تو ممانعت ہے خواہ محض ہو یا قلبی کے ساتھ اور ذکر قلبی کی اجازت ہے اس سے معلوم ہوا کہ بعض وقت ذکر قلبی محض افضل ہے جمع بین ذکر اللسان والقلب سے کیونکہ جب ذکر لسانی سے ممانعت ہوگئی تو اب یا تو بالکل ہی ذکر سے محروم رہو یا محض دل دل سے یاد کرتے رہو ظاہر ہے کہ دوسری

(۱) بجائے غین کے عین پڑھ لے تو معنی بدل جائیں گے (۲) منع ہے۔

صورت یقیناً بہتر ہے کیونکہ صورت اولیٰ(۱) میں پوری محرومی ہے ذکر سے اور اس صورت میں کچھ تو ذکر ہوتا رہے گا اور قطعی محرومی سے یقیناً وہ صورت بہتر ہے جس میں فی الجملہ ذکر باقی ہے اور ایسے وقت میں یہ بقاء ذکر قلبی محض سے ممکن ہے اب اس ذکر کو ذکر نہ کہنا حرمان عن البرکۃ کا مشورہ(۲) دینا ہے تو بہرحال جہاں ذکر لسانی نہ ہوسکے وہاں ذکر قلبی جاری رکھے یعنی تصور رکھے توجہ رکھے اور یاد رکھے دھیان رکھے پس ذکر ہر حالت میں مطلوب ہے تو جس حالت میں جو بھی ممکن ہو کرتا رہے۔

وساوس سے بچنے کا طریقہ

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ کونسا کام ہے جس سے وساوس بند ہوجاویں اور نفس ہر دم کسی شغل میں لگا رہے کیونکہ نفس کو بیکار چھوڑیں گے تو یہ خود اپنے لئے کوئی مضر مشغلہ تجویز کرلے گا اب معلوم ہوگیا کہ وہ کام ذکر قلب ہے جو ہر وقت ممکن ہے بس نفس کو اس شغل میں لگادو تو پھر وہ کوئی مضر شغل خود تجویز نہ کریگا نہ غفلت میں مبتلا ہوگا اور علاوہ مشاہدہ کے حدیث شریف میں اس کی تصریح بھی ہے۔ الشیطان جاثم علی قلب ابن آدم فاذا ذکر اللّٰہ خنس واذا غفل وسوس یعنی ابن آدم کے قلب پر شیطان چڑھا ہوا بیٹھا ہے جب وہ ذکر اللہ کرتا ہے اُس وقت تو ہٹ جاتا ہے اور جب خالی رہتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر نفس کو مشغول نہ کروگے تو یہ خود مشغلہ تجویز کرلے گا۔

شبہ کا جواب

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں قرات تسبیح تکبیر تشہد غرض سب ذکر ہی ذکر ہے مگر باوجود اس کثرت کے ساتھ اُس

(۱) پہلی صورت میں (۲) برکت سے محروم رہنے کا مشورہ دینا ہے۔

کے مشتمل علی الذکر (۱) ہونے کے سب سے زیادہ وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ جب کسی کام میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ صحیح نہیں، کہ جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے تب ہی وہ کسی کام میں لگ جائیگا، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمبخت تو کام کے اندر بھی اپنا کام چلاتا رہتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو خواہ وہ تنہا قلب سے ہو خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو مگر محض زبان سے نہ ہو اگر محض زبان سے یاد ہے تو وہ واقع میں ذکر نہیں بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے اب شبہ جاتا رہا کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں اور جس شخص کو وساوس آتے ہیں وہاں واقع میں ذکر کا وجود نہیں بلکہ محض ذکر کی صورت ہی صورت ہوتی ہے قلب اس کی طرف مشغول نہیں ہوتا چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں اس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا ورنہ النفس لا تتوجه الی شیئین فی آن واحدٍ کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس آ نہیں سکتے۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

اب اس پر ایک اور شبہ ہوا وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا تو پھر ادا کیسے ہوتا ہے کیونکہ فعل اختیاری تو بدون ارادۂ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لئے توجہ لازم ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہوسکتا لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو مگر استمرار میں (۲) توجہ نہ رہی ہو اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف

(۱) نماز پوری کی پوری ذکر ہی ہے (۲) شروع تو توجہ سے کیا تھا لیکن پھر متوجہ نہ رہا۔

رہے گی چلنے کی طرف نہ رہے گی مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے جیسے گھڑی کی کوک (۱) کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینی پڑتی ہے پھر اس کی رفتار کے استمرار و بقاء کے لئے کوک دینے کی ضرورت نہیں رہتی اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں (۲) وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں موثر ہے یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اُسے بجانے بیٹھ گیا تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی حاجت نہیں بلکہ ابتداءً ایک دفعہ قصد کرلیا اور بجانا شروع کردیا اس کے بعد خود بخود ہاتھ وہیں پڑتا ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے اب وہ ارادہ تو کیا کرتا اُسے بعض دفعہ ایسی محویت ہوتی ہے کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں ہوتی اور جیسے قاری ہے کہ قراءت میں اگر ہر ہر لفظ پر نیا قصد کرے تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا وہیں اسکا لہجہ بگڑ گیا بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھنے سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب عادت اور مشق ہوجائے تو پھر ابتداء کے لئے تو قصد کی ضرورت ہوتی ہے استمرار کے لئے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ ان تمام مثالوں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ فعل اختیاری کے صدور کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو بس ابتداء کے لئے توجہ ضروری ہے پس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہوگئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہوگئی اس لئے وساوس بھی آرہے ہیں کیونکہ توجہ نماز کے ہر جزو کے ساتھ متعلق نہیں ہے وہاں تو تکبیر تحریمہ سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کسی توجہ کی ضرورت نہیں ہے ہاتھ پاؤں اس کام کے لئے اسقدر منجھے ہوئے ہیں کہ جب موقع رکوع کا آتا ہے خود رکوع کرلیتے

(۱) گھڑی کی چابی (۲) لمبی سیر کی صورت میں ہر قدم اٹھاتے وقت نئے ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہیں اور سجدہ کا وقت ہوتا ہے خود ہی سجدہ کر لیتے ہیں پس یہ شبہ حل ہو گیا کہ نماز جس میں سب سے زیادہ ذکر ہے یہ کیوں مانع نہیں ہوئی وساوس کو۔ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ مانع کیسے ہو وہاں تو یاد اور توجہ ہی نہیں ورنہ یہ ممکن نہیں کہ توجہ کامل ہو اور پھر وساوس آویں جب چاہو آزمالو۔

بیک وقت دو طرف توجہ

صاحب تم ذرا ایک خط لکھنے بیٹھو پھر دیکھو کیسے وساوس آتے ہیں میں نے بعض دفعہ ایسا کیا ہے کہ قرآن پڑھنے بیٹھا ہوں اور یہ چاہا کہ پڑھنے میں خط بھی لکھ لوں تو نہیں ہو سکا شاید الحمد اور قل ھو اللہ کی دوسری بات ہو کیونکہ وہ تو خوب یاد ہے وہاں شاید توجہ کی ضرورت نہ ہو باقی اور جگہ یا تو پڑھنے میں اٹکے گا یا لکھنے میں بھٹکے گا۔ اب تمام شبہات دور ہو کر وہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ نفس بے شغل بھی نہیں رہ سکتا۔ اور دو شغل میں بھی نہیں لگ سکتا اس لئے فقط مضر(۱) سے بچنا کافی نہیں ہے بلکہ نافع (۲) میں مشغول ہونے کی ضرورت ہے۔

مضامین قرآن کی خوبی

حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں بھی رعایت کی ہے کہ پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فرد یہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرمادی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی آخرت کا ذکر کر دیا کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہئے۔ تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو(۳) سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس کی مذمت(۴) کر دی جاوے اور

(۱) نقصان دہ سے بچنا (۲) فائدہ مند (۳) تاکہ غیر ضروری بات میں مشغول ہونے سے محفوظ رہے (۵) برائی۔

اُس سے ہٹایا جاوے مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے نفع نہیں ہوسکتا کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے یہی دوسرا طریقہ جو اسلم واحسن ہے یہاں اختیار کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ کہ نہیں ہے حیواۃ دنیا مگر لہو ولعب۔ یعنی فضول و بیکار ہے۔ دیکھئے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ حیات دنیا کی مذمت کردیں آگے فرماتے ہیں: ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ اور بے شک دار آخرت ہی حیات ہے یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے دنیا کی کیا زندگی یہ تو اس کے سامنے بالکل ہیچ ہے تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے جس کا مریض دائم المرض ہے(۱) جس کو آجکل کے جاہلانہ محاورہ میں دائم المریض کہتے ہیں۔

الف لام کا بے محل استعمال

آجکل یہ بھی ایک فیشن ہوگیا ہے کہ جس لفظ پر دیکھو الف لام داخل کردیتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ ابتک تو الف لام چار ہی قسم کا تھا یعنی استغراقی۔ جنسی۔ عہد ذہنی۔ عہد خارجی۔ مگر آجکل ایک پانچویں قسم الف لام نیچریت کی ایجاد ہوئی ہے۔ یعنی نئے فیشن کے لوگ کتاب کا نام بھی رکھیں گے تو الف لام ضرور داخل کریں گے مثلاً المامون۔ الفاروق اگر فقط مامون وفاروق نام رکھدیتے تو کیا حرج تھا ایسے ہی الجزائر۔ الجراء غرض ہر

(۱) یہ مریض ایسے مرض میں مبتلاء جو مستقل رہنے والا ہے۔

چیز میں الف لام۔ ایسے ہی قریب المرگ دائم المریض کا الف لام کہ اس کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اور الف لام سے قطع نظر کر کے دائم المریض کی تو ترکیب ہی ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہمیشہ کے بیمار کو دائم المرض کہہ سکتے ہیں نہ کہ دائم المریض اگر مریض ہی کا لفظ لانا ضروری تھا تو دائمی مریض کہہ لیتے البتہ دائم المریض کے معنی یہ تو ہو سکتے ہیں کہ جس کے پاس ہمیشہ مریض رہیں جس طرح دائم المرض کے معنی یہ ہیں کہ جس کو ہمیشہ مرض رہے پس اس معنی کے اعتبار سے دائم المریض حکیم یا ڈاکٹر کو کہہ سکتے ہیں نہ کہ مریض کو۔

علاج کی ضرورت

بہرحال جو دائم المرض ہوگا اس کو دوا بھی دائمی ہی دی جائے گی تو جب یہ مرض حب دنیا ہمیشہ کا ہے تو ہمیشہ اس کی دوا استعمال کرتے رہنا چاہئے یہاں تک کہ اگر اتفاق سے بزرگ بھی ہو جاویں تو اس وقت بھی اس مرض سے اور اس کے علاج سے بے فکر نہ ہونا چاہئے کیونکہ اپنے نزدیک بزرگ بن جانے سے واقع میں بزرگ نہیں ہو سکتا مگر اب تو یہ حالت ہے کہ جہاں ذرا بھی کوئی درجہ مقصود کا حاصل ہو گیا مثلاً معصیت (۱) سے نفرت ہو گئی یا نفل میں دل لگنے لگا یا وساوس و خطرات بند ہو گئے تو بس گمان ہو گیا کہ اب میں کامل ہو گیا ہوں پھر کیا تھا سب مجاہدے اور ریاضت چھوڑ بیٹھا۔ اسی لئے ضرورت ہے ہر وقت شیخ کی ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند (۲)

یعنی کسی کامل سے تشخیص کراؤ کہ یہ حالت کمال کی ہے یا نہیں ورنہ وہ حالت ہو گی جیسے دق والے کو اگر ایک دن بخار نہیں آیا تو وہ یہ سمجھے کہ یہ اچھا ہو گیا اور علاج چھوڑ بیٹھے۔

(۱) گناہ (۲) اپنے آپ کو ہمیشہ کسی صاحب نظر بزرگ کی زیر نگرانی رکھو چند گدھوں کی تصدیق سے آدمی عیسیٰ نہیں بن جاتا۔

سالکین کی غلطی

یاد رکھو مرض کا نکس (یعنی لوٹنا) بداء سے (یعنی شروع ہونے سے) بھی اشد ہے(۱) کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مرض پھر لوٹے اور علاج مشکل ہوجائے تو جس طرح بعض مریض ظاہری ذرا بخار نہ آنے کو صحت سمجھ لیتا ہے اسی طرح بعض اہل طریق بھی جہاں تھوڑی سی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوئی اور سمجھ گئے کہ بس ہم کامل ہوگئے پھر تسبیح بھی چھوٹ گئی اور مجاہدہ بھی گیا اور یہ گمان ہوگیا کہ بس اب تو ہم منتہی ہوگئے(۲) ہمیں اب کسی ریاضت(۳) کی حاجت نہیں رہی اور ہم اس کے مصداق ہوگئے۔ خلوت و چلہ بر ولازم نماند(۴)۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے اجی تم تو جیسے تھے ویسے ہی ہوگئے بلکہ اُس سے بھی بدتر ہوگئے کیونکہ جیسے ابتدائے مرض سے عود مرض سخت ہوتا ہے(۵) اسی طرح تمہاری یہ حالت اشد ہے پہلی مجوبی کی حالت سے(۶) جس پر یہ حالت پیش آئے وہ خود غور کرکے دیکھ لے اس وقت بہ نسبت پہلے کے طبیعت کی کیا کیفیت ہے حالت یہ ہوتی ہے کہ طاعت سے دل گھبرانے لگتا ہے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اباء واعراض(۷) وانکار پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ حالت یہاں تک ترقی کرتی ہے کہ اس کے بعد شدہ شدہ حق تعالیٰ سے عداوت(۸) پیدا ہوجاتی ہے کہ خدا کو اپنے سے اور اپنے کو خدا سے ناخوش پاتا ہے بس یہ سرحد ہے کفر کی۔ نعوذ باللہ منہ۔

---

(۱) سخت ہے (۲) سلوک کے آخری درجہ پر فائز ہوگئے ہیں (۳) مجاہدے کی (۴) تنہائی میں رہنا اور چلہ کشی اب ہم پر لازم نہیں (۵) جیسے مرض کی ابتداء سے اس کا دوبارہ لوٹنا سخت ہے (۶) پہلی حجاب کی حالت سے یہ زیادہ سخت حالت ہے (۷) نفرت ودوری (۸) دشمنی۔

حجابات کے درجات

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فوائد الفوائد میں لکھا ہے کہ حجابات کے سات درجے ہیں ان میں ایک درجہ عداوت ہے اولاً طبعی۔ اور عداوت طبعی کے بعد پھر آخری درجہ کفر ہے اختیاری۔ اور ادنیٰ درجہ حجاب کا معمولات کا اختلال (۱) ہے کہ خدا کے ساتھ جو برتاؤ اور تعلق چلا آرہا ہے اُس میں کمی کردے یہ ادنیٰ حجاب ہے اور اسی سے بڑھتے بڑھتے حجابات کثیرہ پیدا ہوجاتے ہیں اس لئے اس ادنیٰ سے بھی بچنا چاہئے۔ اسی واسطے حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ یا عبداللّٰہ لا تکن مثل فلان کان یصلی من اللیل ثم ترکھا کہ اے عبداللہ ایسے مت ہوجاتا جیسا فلاں شخص تھا کہ اول تہجد کی نماز پڑھتا تھا پھر چھوڑ دی۔ باقی یہ سمجھنا کہ مجھے کمال حاصل ہوگیا یہ تو صاف اعجاب اور کبر (۲) کا شعبہ ہے صاحب تھوڑی سی سنسناہٹ پیدا ہوجانے سے کمال حاصل نہیں ہوجاتا اسے کسی شیخ کی تشخیص پر چھوڑ دو اپنی رائے سے کچھ مت سمجھو۔

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

صوفی کے صاف ہونے کے لئے ایک جام کی اور خام کی پختگی کے لئے بہت سفر کی ضرورت ہے بڑی مدت میں خام کے اندر پختگی آتی ہے یہ نفس کا دھوکہ ہے کہ اپنے کو کامل سمجھ کر سب کام چھوڑ بیٹھے اس کے دھوکے میں نہ پڑنا چاہئے اور اپنی حالت پر کبھی اعتماد نہ کرنا چاہئے۔

مجوزہ معمولات کی پابندی

جو تجویز کسی مبصر نے کردی ہے عمر بھر اُسی میں مشغول رہنا چاہیے کیونکہ

(۱) سب سے کم درجہ حجاب کا یہ ہے کہ معمولات میں خلل پڑنے لگے (۲) یہ تو تکبر اور بڑائی کا اظہار ہے۔

اُس کے ترک میں یہ ہوتا ہے کہ بتدریج کمی ہوتی رہتی ہے جس کا ادراک بھی مشکل ہے مثال کے طور پر یوں سمجھے کہ کسی نے ایک پھول کا درخت لگایا اُسے خوب پانی دیا اور بڑھ گیا اب کثرت سے پھول بھی لگنے لگے اب یہ سمجھ کر پانی دینا چھوڑ دیا کہ اب تو یہ مکمل ہوگیا ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلے تو پھول چھوٹا پڑ جاویگا پھر پھول لگنا بند ہوجائیگا اور اس کے بعد درخت مرجھا کر خشک ہوجائیگا ہاں اتنا تو کرسکتا ہے کہ پہلے کثرت سے مجاہدے کرتا تھا اب کبھی کبھی کرلے جیسے ابتداء میں درخت کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے بڑھ جانے کے بعد اتنی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مبتدی ومنتہی کی طاعت میں بڑا فرق ہے یہ ضروری نہیں کہ جتنے مجاہدے ریاضات مبتدی کرتا تھا اُتنے ہی منتہی بھی کرے مگر یہ تو ضرور ہے کہ منتہی بھی کچھ کرے اس کے تھوڑے مجاہدے بھی مبتدی کے بیسیوں مجاہدوں سے افضل ہیں اور صورت بھی دونوں مجاہدوں کی جدا جدا ہوتی ہے۔

منتہی کا حال

اور مولانا نے جو منتہی کی نسبت فرمایا ہے ؎

خلوت وچلہ برولازم نماند(۱)

سو یہ نہیں فرمایا کہ طاعت واحکام دین لازم نماند(۲)۔ بس اس کی شان عوام الناس کی سی ہوجاتی ہے اس کی عبادت بھی ایسی لطیف ہوتی ہے کہ دوسرا ادراک نہیں کرسکتا نہ وہ نفلیں بہت پڑھتا ہے نہ تلاوت بہت کرتا ہے بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بظاہر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو وعظ و تقریر میں خوب حظ نفس ہوتا ہے حالانکہ جو کچھ بات چیت منتہی کررہا ہے وہ محض

(۱) اس کے ذمہ خلوت اور چلہ کشی لازم نہیں (۲) یہ نہیں کہا کہ اطاعت الٰہی اور احکام دین کی پابندی لازم نہیں۔

خدمت کے خیال سے کر رہا ہے اس میں اُسے کچھ حظ نہیں ہوتا بلکہ زبان سے تو بات چیت کر رہا ہے اور دل منقبض ہو رہا ہے(۱) مگر دوسرے کی مصلحت کے واسطے سب کچھ برداشت کر رہا ہے اس آیت سے اس کیفیت کا پتہ چلتا ہے ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ الخ ﴾ یعنی اپنے نفس کو ضبط کر کے اور گھونٹ کر بیٹھے یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما تکرہہ یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اُس کو ناگوار ہو اس سے معلوم ہوا کہ آپ مجمع سے گھبراتے تھے مگر لوگوں کی مصلحت کے لئے مجبوراً بیٹھتے تھے صاحبو ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے کیونکہ ان کی نظر تو اور ہی طرف ہے جس کو جامی فرماتے ہیں ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے (۲)

اور ان کی یہ شان ہوتی ہے ؎

غیرت از چشم برم روئی تو دیدن نہ ہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ ہم (۳)

ان کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تو دوست تو کیوں نہ موجب پریشانی ہوں گے لوگ ان کو تعظیم و تکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے چین میں ہیں مگر کوئی انہیں کے دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گذرتی ہے ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند (۴)

کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجانست و مخالطت کو برداشت کرتے ہیں ؎

---

(۱) دل گھٹ رہا ہے (۲) وہ بہت عمدہ وقت اور بہترین دن ہے جس دن ایک محبوب اپنے محبوب سے ملے (۳) اپنی آنکھ بھی بری لگتی ہے کہ تیرے دیدار میں رکاوٹ ہے اور کان بھی برا لگتا ہے کہ تیری بات سننے میں حارج ہے (۴) تیرے پیر میں تو کانٹا بھی نہیں چبھا تو ان شیروں کے زخم سے کیا واقف ہوگا جنہوں نے اپنے سر پر تلواروں کے زخم کھائے ہیں۔

درنیا بد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام(۱)

غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پاکاں راقیاس از خودمگیر گرچہ ماند در نوشتن شیروشیر(۲)

انہیں بیحد انقباض ہوتا ہے۔ دوستوں سے اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ آپ کو اسکا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول بھی رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں۔

مکالمہ عیسیٰ و یحییٰ علیہم السلام

اس پریشانی اور ضحک کے اجتماع پر ایک قصہ یاد آیا لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہنستے بہت تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام روتے بہت تھے ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے آپ رحمت سے مایوس ہوگئے ہیں جو اس قدر روتے ہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شاید آپ عذاب سے بے خوف ہوگئے ہیں جو اس قدر ہنستے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ فیصلہ کے لئے آیا اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اے یحییٰ آپ خلوت (۳) میں تو ایسے رہئے جیسے اس وقت ہیں اور جلوت (۴) میں ایسے رہئے جیسے عیسیٰ ہیں اور اے عیسیٰ آپ جلوت میں تو ایسے ہی رہئے جیسے اس وقت ہیں اور خلوت میں ایسے رہیے جیسے یحییٰ ہیں آپ کو خلوت میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو نڈر اور بے خوف کا کام ہے اور اے یحییٰ اگر آپ جلوت میں بھی ایسے ہی روتے رہیں گے تو میرے بندے ناامید ہوجائیں گے۔

---

(۱) تو ابھی تک نابالغ ہے تجھے پختہ کار کے حال کا کیا علم ہوسکتا پس باتیں نہ بنا تجھ پر سلام ہے (۲) خود کو نیک لوگوں پر قیاس نہ کرو اگرچہ لکھنے میں شَیر اور شِیر ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں لیکن دونوں میں بہت فرق ہے (۳) تنہائی (۴) عام مجلس۔

تو وہ اس لئے ہنستے ہیں تا کہ مخلوق نا امید نہ ہوجائے ان کی ہنسی لوگوں کی مصلحت کے لئے ہوتی ہے کہ انہیں نفع پہنچے اور تا کہ وہ دل شکستہ نہ ہو(۱)۔ تو صاحبو! ان کی عبادت اس قسم کی ہوتی ہے کہ لوگ اسے لذت اور حظ نفس سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ مجاہدات ہیں یہی وجہ ہے کہ جناب رسول مقبول ﷺ نے تبسم سے زیادہ ضحک کبھی نہیں (۲) فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی ہے اور غم کا اثر ہوتا ہے وہ جب بھی ہنسے گا کوشش اور قصد (۳) سے ہنسے گا اور قصد کی ہنسی قابو میں ہوتی ہے اس لئے آپ کی ہنسی تبسم سے زیادہ نہ ہوتی تھی شب و روز دیکھ لو اگر کسی کو ذرا رنج ہوتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جہاں کسی نے اُس سے ہنسی کی بات کی فوراً غصہ آجاتا ہے لیکن اگر رنج کا سبب قابل اخفا ہوتا ہے تو اُس کو اس خیال سے ہنسی کی صورت بنانی پڑتی ہے کہ اگر نہ ہنسوں گا تو راز کھل جائے گا اس لئے زبردستی منہ چڑانا پڑتا ہے غرض بڑی مصیبت سے ہنسی آتی ہے بس یہی حال اہل فکر کا ہوتا ہے اور ایک ہم بے فکرے ہیں کہ ذرا سے اشارہ میں محلّہ کو سر پر اُٹھالیتے ہیں معمولی سی ہنسی کی بات پر لوٹ جاتے ہیں اور ایک حضور ﷺ کا ہنسنا ہے کہ فقط تبسم فرماتے تھے اور وہ بھی اُمت کی مصلحت کے لئے اور آپ ہنستے بھی کیسے۔ آپ تو اُمت کے لئے طویل الاحزان دائم الفکر رہتے تھے (۴)۔ جو ہر وقت فکر میں ہوگا اُسے کیونکر ہنسی آئیگی ۔

چوں چنیں کارے ست اندر راہ ترا خواب چوں می آید اے ابلہ ترا(۵)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ان کے سامنے سے ایک جماعت بے فکروں کی نکلی ہنستے ہوئے جارہے تھے انہوں نے کہا کہ تم کو

(۱) ان کا دل نہ ٹوٹ جائے (۲) آپ کی ہنسی مسکراہٹ سے زیادہ کبھی نہیں بڑھی (۳) ارادہ سے (۴) ہمیشہ غمزدہ اور فکرمند رہتے تھے (۵) جب ہر وقت کی فکر انگیزی تیرا مشغلہ ہے، تو تجھے ایسے خواب کیسے آسکتے ہیں۔

پل صراط پر چڑھنا تو معلوم ہے اور اترنے کی خبر نہیں پھر کیسے ہنسی آتی ہے (مطلب یہ تھا کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (۱) ہر شخص کو جہنم کے اوپر سے گذرنا ضروری ہے اور یہ خبر نہیں کہ پھر پار ہوں گے یا دوچار ہوں گے اس حالت میں تمہارا ہنسنا حیرت انگیز ہے واقعی خوب کہا ایسی بیساختہ ہنسی تو اُسی کو آتی ہے جس کے قلب میں بے فکری ہو۔ غرض ہمیں ہر وقت اپنی حالت کو سوچتے رہنا چاہئے اور کبھی اپنے متعلق کمال کا گمان نہ ہونا چاہئے جس سے عبادت میں کمی کر دی جاوے اور بالفرض اگر کمال کو حاصل بھی فرض کرلیا جاوے۔ تب بھی بیفکری کی کوئی وجہ نہیں اگر خلوت وچلہ (۲) لازم نہیں رہا تو عبادت سے تو خالی نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس درجہ پر پہنچ کر تو عبادت زیادہ دقیق ولطیف ہوجاتی ہے جس کی رعایت میں خاص اہتمام کی حاجت ہوتی ہے۔

وجہ انتخاب مضمون

خلاصہ یہ کہ عبادت کا ترک ہر وقت مضر ہے (۳) اور کمال کا اعتقاد بھی مضر ہے کہ یہ عبادات ترک کرادیتا ہے اسی واسطے یہ مضمون یعنی فکر اصلاح وتکمیل دین ہر وقت کی ضرورت کا ہے اور ہر چند کہ اسکا بیان ضرورت کی قدر بھی کافی تھا کیونکہ سب کے نزدیک مسلم ہے زیادہ تطویل (۴) کی ضرورت نہ تھی مگر اس کے متعلق زیادہ بیان کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ جس مکان میں اس وقت بیان ہورہا ہے اس وقت اس کی تکمیل ہوچکی ہے اور اس کے مالک کا سکونت کے لئے اس میں آجانے کا ارادہ ہے اور یہ حالت مظنہ تھی اس کے ساتھ زیادہ شغل ہے قلب کا (۵) جو ایک قسم کا انہماک ہے دار دنیا کے ساتھ، اس لئے ضرورت تھی

(۱) اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ ہر ایک کو اس پر سے گذرنا ہے (۲) تنہائی میں بیٹھ کر چلہ کشی لازم نہیں رہی (۳) نقصان دہ (۴) تفصیل (۵) اس حالت میں گمان غالب تھا کہ دل اس کے ساتھ مشغول ہوجائے گا۔

کہ اس انہماک کی مذمت اور شغل آخرت کی ضرورت کا کسی قدر خاص اہتمام سے بیان کیا جاوے یہ وجہ ہوگئی کسی قدر تطویل کی بہر حال اس آیت میں دار دنیا اور دار آخرت کے ساتھ جو معاملہ کیا جاوے اس کا ذکر ہے جس کے عموم میں خاص مکان بھی آ گیا اور ایک آیت میں خاص مکان یعنی مساکن کا معاملہ بھی ذکر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی مساکن کے ساتھ اتنا محظوظ ہونا کہ آخرت سے غافل کردے مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ یعنی فرمادیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت سے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب ہیں تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے۔ یہ محل وعید میں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں یہ سب چیزیں مذکور ہوئی ہیں خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں تو حکم ثانی کا انتظار کرو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حب مساکن (۱) پر وعید نہیں ہے اور نہ رضا بالساکن (۲) پر وعید ہے یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی وعید نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے اب وعید کا ہے پر ہے (۳) صرف احب الیکم پر کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل وعید ہیں اس میں بھی

(۱) صرف گھر سے محبت ہونے پر (۲) نہ گھر میں رہنے پر راضی ہونے پر (۳) وعید کس چیز پر ہے۔

مطلق محبوب ہونے پر وعید نہیں۔ تو مکان کا نہ مرضی ہونا محل وعید ہے نہ محبوب ہونا بلکہ احب من اللہ ہونا محل وعید ہے۔ (۱)

تعمیر مکان میں مأذون درجہ

اب اگر کوئی شخص بقدر ضرورت مکان بنوالے جس میں اسراف و تفاخر نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ لوگوں کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف ہیں کسی کو ایک حجرہ آسائش وراحت کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مشکل سے کافی ہوتا ہے۔ بہرحال عمدہ پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً ماذون فیہ ہے چنانچہ اس کے عدم جواز کا کسی کا بھی مذہب نہیں ہے ایک شخص کو زیادہ سردی لگتی ہے وہ لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا (۲) ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے دونوں کا اسراف الگ الگ ہے بہرحال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے ہاں ضرورت سے آگے ایک درجہ آرائش کا ہے وہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور نہ قصد فخر وعجب کا اختلاط ہو کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو ناجائز ہے۔

اسراف کے معنی

اور اسراف کے معنی یہ ہیں کہ منہی عنہ کا ارتکاب (۳) نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت (۴) میں خرچ نہ ہو اس میں بھی تھوڑی سی تفصیل ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی شئی ایک شخص کے اعتبار سے اسراف ہوسکتی ہے اور دوسرے شخص کے اعتبار

(۱) ضرورت کے مطابق اور پسندیدہ مکان بنانے پر وعید نہیں ہے بلکہ وعید اس بات پر ہے کہ مکان اللہ سے زیادہ محبوب نہ ہوجائے (۲) سردی (۳) جس بات سے منع کیا گیا ہے اس کا ارتکاب نہ کرے (۴) گناہ کے کام میں خرچ نہ ہو۔

سے اسراف نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص کو دس روپیہ گز کا کپڑا پہننے کی وسعت(۱) ہے اور ایک شخص کو ایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں یہ اگر دس روپیہ گز کا کپڑا خریدے گا تو ضرور قرضدار ہوگا۔ اب دونوں نے یہ کپڑا خریدا تو جسکو وسعت ہے اس کے لئے تو کچھ حرج نہیں نہ اُس پر اسراف کا الزام۔ اور جس نے قرض لیا وہ بے ضرورت گردن پھنسانے سے گناہ گار ہوگا، مسرف(۲) شمار ہوگا کیونکہ بلا ضرورت مقروض ہونا گناہ ہے دیکھئے دس روپہ گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے مگر ایک کے لئے گناہ نہیں ہے اور ایک کے لئے گناہ ہے۔ بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے اس کے لئے موجب گناہ بن گیا۔ اور وہ عارض کیا تھا۔ بلاضرورت قرض لینا اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت(۳) میں مبتلا نہ ہوتا اس لئے اس کے لئے اتنا اچھا اور قیمتی پہننا بھی گناہ ہے کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہوتا ہے تو بہرحال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ ایک آسائش اور ایک ارائش، ایک نمائش، تو اسائش تو ہر ایک کے لئے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے(۴) گو اس کا ترک اولیٰ ہے(۵) اور نمائش جس میں ریاء وکبر وعجب اور فخر ہوتا ہے یہ حرام ہے اب اسکا فیصلہ ہر شخص کے تدین(۶) پر ہے کہ اس کی نیت کیا ہے اگر دل میں غور کرکے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لئے کیا ہے تو تاویل کرکے اس کو ارائش میں داخل نہ کرے مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے بلکہ حسن ظن رکھے تو خلاصہ یہ ہوا کہ مساکن

(۱) گنجائش (۲) اسراف کرنے والا (۳) بلاضرورت قرض لینے کے گناہ میں مبتلا نہ ہوتا (۴) جائز ہے (۵) اگرچہ اس کو نہ کرنا بہتر ہے (۶) ہر شخص کی دینداری پر ہے۔

مرضیہ اگر احب من اللہ ہوں تب محل وعید ہیں ورنہ نہیں (۱) سو مدار وعید مساکن مرضیہ نہیں (۲) پس قید ترضونھا بیان فرما کر پھر اس پر وعید کا مدار نہ رکھنے سے اپنی پسند کا مکان بنانے کی اجازت مستنبط ہوتی ہے (۳) اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اُس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے یعنی اس کی جانب میلان قلب کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محبت خدا اور رسول کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو اگر زیادہ ہوگی تو گنہگار ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مساکن کے متعلق یہ آداب ہیں جنہیں میں بقدر ضرورت اس کے قبل کے وعظ میں جو اسی مکان کے دوسرے حصہ میں ہوا تھا بیان کر چکا ہوں۔

تذکرہ دار آخرت

حق تعالیٰ نے اس آیت مقصود بالبیان میں بھی دار آخرت کے مقابلہ میں حیات دنیا کو بیان کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ دار آخرت پر حیات دنیا کو ترجیح نہ ہونی چاہئے تو لفظی مناسبت تو اس مضمون کے اختیار کرنے کی ظاہر ہی ہے کہ افتتاح دار کے لئے یہ وعظ ہوا ہے اور ان آیات میں بھی دار آخرت کا تذکرہ ہے مگر معنی کے اعتبار سے اُن میں ایک عام مضمون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آخرت سے بیفکری نہ ہونی چاہئے اور گو اس کے لئے یوں بھی فرما سکتے تھے کہ اطلبوا الآخرۃ واترکوا الدنیا کہ آخرت کی جستجو کرو اور دنیا کو چھوڑ دو مگر اس طرح نہیں بیان کیا کیونکہ حق تعالیٰ کو اس مضمون کے ساتھ ساتھ دونوں کی حالت کا دکھلانا بھی مقصود ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی کرنا ہے کہ اس حالت کے بعد ہر شخص خود ہی فیصلہ کر لے کہ دونوں میں کون توجہ کے قابل ہے اور کون ترک کے قابل اسی لئے

(۱) پسندیدہ گھر اگر اللہ کی محبت سے زیادہ محبوب ہوں تب ان پر وعید ہے، ورنہ نہیں (۲) قرآن میں مذکور وعید پسندیدہ گھروں پر نہیں ہے (۳) پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

امر و نہی کے صیغہ سے نہیں بیان کیا بلکہ بصورت اخبار یوں فرمایا کہ وما ھذہ الحیواۃ الدنیا الا لھو ولعب اور نہیں ہے حیات دنیا مگر لہو اور لعب۔ یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک لہو اور ایک لعب۔ اور دونوں کے مفہوم میں لغۃً کچھ فرق ہے وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو اس سے معلوم ہوا کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اسمیں دو صفتیں ہیں ایک تو لہو ہونے کی کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لبھاتی اور مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی کہ اسمیں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جیسے بچوں کا کھیل کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

حیات دنیوی کا مذموم درجہ

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے جس میں محض لہو ولعب ہو یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ دنیائے صوری کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو۔ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔ یہاں سے اصلاح ہوئی غالی فی الزہد (۱) اور زاہد خشک کی، کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے (۲) عمدہ کپڑا۔ اچھا کھانا۔ ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں تو نان ونفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا سمجھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ گھر والوں کے معالجہ کے لئے میرٹھ

(۱) زہد میں غلو کرنے والے (۲) بری ہے۔

گیا تو وہاں ایک عورت نے مجھ سے بیعت کی درخواست کی تو ایک دوسری عورت نے اُس عورت کو یہ رائے دی کہ تو ہمارے پیر سے بیعت کرنا جو ایسے بزرگ ہیں کہ پچاس برس سے بیوی سے بولے بھی نہیں اور جس مولوی سے تو مرید ہونا چاہتی ہے وہ تو بیوی کو علاج کے لئے ساتھ لیے لیے پھرتے ہیں اور جاہل نے یہ نہ خیال کیا کہ یہ پیر صاحب تو پچاس برس سے حقوق العباد تلف کرنے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی میں گرفتار ہورہے ہیں یہ بزرگ کیسے ہوسکتے ہیں۔ غرض اس آیت سے ایسے زاہدان خشک کی بھی اصلاح ہوگئی کہ دنیا اُسے ہی نہیں کہتے جسے تم دنیا سمجھتے ہو یعنی روپیہ پیسہ وغیرہ بلکہ دنیا تو درحقیقت لہو ولعب کا نام ہے جہاں یہ نہ ہو وہاں دنیا بھی نہ ہوگی اور جہاں یہ ہو وہاں دنیا ہوگی گو ظاہری سامان کچھ نہ ہو۔

قرآن وحدیث میں دنیا کا اطلاق

اور اصل بات یہ ہے کہ یہاں دنیا مقابل آخرت کے ہے اور دنیا کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے ایک تو دین کے مقابلہ میں دنیا بولی جاتی ہے جس کے معنی بے دینی کے ہوتے ہیں اور ایک آخرت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے جس کے معنی حیات دنیا کے ہوتے ہیں اور قرآن وحدیث میں دنیا کا استعمال دونوں معنی میں آیا ہے سو آیت میں تو دنیا مقابلہ میں آخرت کے ہے اس میں دو قسمیں ہیں مذموم یعنی لہو ولعب وغیر مذموم یعنی اموال امتاع وغیرہ پس وہ علی الاطلاق مذموم نہیں اور مذموم وہ ہے جو دین کے مقابلہ میں ہو جیسے حب الدنیا راس کل خطیئۃ کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے یہاں دنیا مقابلہ میں دین کے بولی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ بے دینی کی باتوں سے محبت نہ کرنا چاہئے اور یہ معنی نہیں کہ بیوی بچوں سے بھی محبت نہ کرے کیونکہ یہ بے دینی کی چیزیں تھوڑا ہی ہیں بلکہ یہ تو نکاح کا نتیجہ

ہیں جو دین ہے۔ غرض دنیا وہ مذموم ہے جو دین میں مضر ہے ۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش ونقرۂ وفرزند وزن

یعنی دنیا کسے کہتے ہیں خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال دولت اور بیوی بچوں کو آگے ایسے ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں ۔

اہل دنیا چہ کہین وچہ مہیں لعنۃ اللہ علیہم اجمعین (۱)

سوال کا جواب

یہاں پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کردی۔ جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے ایک حدیث کا جس میں حضور فرماتے ہیں: الدنیا ملعون وملعون ما فیھا الا ذکر اللّٰہ وما والاہ او عالم او متعلم یعنی دنیا خدا کی رحمت سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے مگر خدا کا ذکر اور اسکے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اور عالم یا متعلم یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے بعد نہیں ہے(۲) باقی سب رحمت سے بعید ہیں(۳) اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے متصل نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں تو لعنت یعنی بُعد عن الرحمۃ کا حکم خاص اُن پر کررہے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو چنانچہ قرینہ اسکا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں ۔

اہل دنیا کافران مطلق اند روز وشب درزق زق ودربق بق اند

اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر ہی کہدیا مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی۔ جس کے بعد

(۱) دنیادار کیا چھوٹا کیا بڑا سب پر اللہ کی لعنت (۲) رحمت خداوندی سے دوری نہیں ہے (۳) دور۔

یہ قرینہ ہوگیا بعد عن الرحمت کے محل کا وہ توجیہ یہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتداء اور کافران مطلق خبر نہیں ہے بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر ہے یعنی جو کافران مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں۔ مؤمن اہل دنیا ہے ہی نہیں کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہوگیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے ملعون نہیں ہیں تو کون مؤمن ایسا ہوگا جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ (۱) نہ رکھتا ہوگا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو۔

اسباب دنیا

باقی اسباب دنیا، تو اسمیں حدیث نے دو قسمیں کردی ہیں۔ ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اُس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلاً دخل نہ رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیائے محضہ اور مذموم ہے (۲) اور اُسی کو لہو ولعب فرمایا گیا ہے تو حق تعالیٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرمادیا ہے کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں بلکہ توجہ کی قابل تو آخرت ہے اسی کو ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ مرض تھا ہمارے اندر جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرمادیا ہے کہ دنیا وآخرت دونوں کے حالات یعنی لہوولعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتادئے تاکہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کرسکے کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل۔

(۱) تعلق (۲) یہی اصل میں خالص دنیا ہے جو ناپسندیدہ ہے۔

اعمال کی حقیقت

اور یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتی ہیں آخرت میں واقع میں دنیا نہیں ہیں کیونکہ لہو ولعب نہیں، اسی طرح اس کے مقابل وہ آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے لئے ہیں اور واقع میں دنیا کے لئے ہیں وہ آخرت نہیں ہیں ۔

کلید در دوزخ است آں نماز کہ در چشم مردم گذاری دراز (۱)

یعنی وہ نماز دوزخ کی کنجی ہے جس سے دوزخ کا دروازہ کھل جائیگا جو ریاء اور شہرت کے واسطے پڑھی جاوے کیونکہ لہو ولعب کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ لعب وہ شغل ہے جو ثمرہ سے خالی ہو۔

اور یہ نماز بھی فی الواقع ثمرہ سے خالی ہے تو یہ دنیا ہوئی آخرت بمعنی دین نہیں ہوئی۔

آخرت میں تین لوگوں کا حال

حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ایک شہید کو بلائیں گے فیسئل عنہ ما ذا قدمت فیقول قاتلت فی سبیلك حتی استشھدت فیقال لابل انما قاتلت لیقال انك لجرئ فقد قیل فیؤمر بہ فیلقی فی النار او کما قال اُس سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے لئے کیا کام کیا وہ کہے گا اے میرے رب میں نے آپ کے راستہ میں جہاد کیا تھا یہاں تک کہ شہید ہو گیا ارشاد ہوگا نہیں! تم نے جہاد اس لئے نہیں کیا تھا، بلکہ اس لئے کیا تا کہ لوگ یوں کہیں کہ بھئی بڑا ہی بہادر ہے تو یہ کہدیا گیا، یعنی جس کے لئے تم نے جہاد کیا وہ تمہیں حاصل

(۱) ایسی نماز جو لوگوں کو دکھانے کے لئے لمبی پڑھی جائے وہ دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے۔

ہو چکا پس اُس کا فیصلہ کر دیا جائیگا۔ اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائیگا۔ اسی طرح ایک سخی کو بلائیں گے اور اس کا بھی یہی حشر ہوگا کہ ہمارے لئے تم نے سخاوت نہیں کی بلکہ اس لئے تم نے سخاوت کی تھی لیقال انك جواد فقد قیل تا کہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا سخی ہے تو بہت تعریف ہو چکی۔ اسی طرح ایک عالم کو بلائیں گے سوال ہوگا تم نے کیا کیا۔ عرض کریگا میں نے آپ کی رضا کے لئے وعظ کہا۔ اور یہ کیا وہ کیا ارشاد ہوگا نہیں! اس لئے یہ کام نہیں کیا بلکہ اس لئے کیا لیقال انك لقارئ یہ کہا جاوے کہ یہ بڑے عالم ہیں تو آپ کی بھی بہت تعریف ہو چکی اب یہاں کیا رکھا ہے۔ تو دیکھئے شہادت، سخاوت، علم، دین کی خدمت جو اس طریقہ مذکورہ فی الحدیث سے ہو وہ بھی دنیا ہی ہے اگرچہ صورت اُس کی آخرت کی ہے۔

مومن اور کافر کے صدقہ میں فرق

چنانچہ ایک خرچ کرنا کفار کا تھا کہ اپنے نزدیک نیک کام سمجھ کر کرتے تھے مگر پھر بھی اُن کی مذمت(۱) کی گئی کیونکہ وہ محض صورت دین تھی اور حقیقت میں وہ انفاق دین(۲) نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾(۳) یعنی کفار اپنے اموال اس لئے خرچ کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے باز رکھیں اور ایک خرچ اہل ایمان کا تھا کہ لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا تا کہ خدا ہی کا نام بلند ہو جیسے ارشاد ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾(۴) کہ جو لوگ خدا کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ (زمین میں ڈالا گیا) ہو جس سے سات بالیاں اُگی

(۱) برائی (۲) دین کے راستہ میں خرچ کرنا نہیں تھا (۳) سورۃ الانفال: ۳۶ (۴) سورۃ البقرۃ: ۲۶۱۔

ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں گویا ایک سے سات سو ہوگئے۔ دیکھئے حالانکہ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں خرچ کرتے ہیں اور دونوں کا انفاق بھی حیات دنیا ہی میں ہوتا ہے اور دونوں کا مقصد بھی بزعم منفق اعانت (۱) دین ہی ہوتا ہے جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں افعال میں اشتراک ہے مگر چونکہ یہ دین مقبول ہے اس لئے اس کے لئے انفاق بھی دین ہے۔ اور وہ دین باطل ہے اِس لئے اُس کے لئے انفاق دنیا ہوا گوصورۃ اتحاد واشتراک (۲) ہے مگر حقیقۃً دونوں میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ایک دنیا ہے اور ایک دین۔ اسی طرح ہر عمل کی یہی کیفیت ہے کہ محض صورۃً دین ہونے سے وہ دین نہیں بن سکتا اور نہ صورۃً دنیا ہونے سے دنیا بنتا ہے۔ پس اس کی بڑی ضرورت ہے کہ نظر وغور کرکے دیکھا جائے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں آیا وہ دین کے لئے خلوص اور خوش نیتی سے کررہے ہیں یا ایسا نہیں، اگر خلوص سے کررہے ہیں تو وہ مقبول ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

اعمال میں درجہ کمال کے حصول کا طریقہ

اب اس کے بعد دو قسم کی طبیعت کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جو دین کو دنیا کے واسطے کرتے ہیں جس کا مذموم (۳) ہونا ظاہر ہے اور ایک وہ ہیں جو دین کا کام اس لئے بالکل چھوڑے بیٹھے ہیں کہ نیت تو آخرت کی ہے ہی نہیں پھر بلانیت کرکے کیا کریں۔ چنانچہ یہی سمجھ کر بہت سے جاہل لوگوں نے نماز چھوڑ دی کہ جیسی مطلوب ہے ویسی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ تو پڑھنے سے کیا فائدہ بعض نے روزہ چھوڑ دیا کہ جیسا ہونا چاہئے ویسا تو ہو نہیں سکتا پھر رکھنے سے کیا فائدہ۔ اے صاحبو!

(۱) خرچ کرنے والے کے گمان میں دین کی مدد کرنا ہی ہوتا ہے (۲) صورۃ کے اعتبار سے اگرچہ دونوں مشترک ہیں (۳) برا ہونا۔

یہ بڑی غلطی ہے روزہ ونماز حقیقی کے حاصل کرنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ پہلے روزہ ونماز صوری کو اختیار کرو گو خلوص نہ ہو مگر شرط یہ ہے کہ اس کی ضد بھی نہ ہو خلو کا درجہ ہو(۱) اسی سے خلوص ہوجاتا ہے اور کرتے کرتے نیت بھی درست ہوجاتی ہے اور یہ نفس کا حیلہ و بہانہ ہے کہ جب کامل عمل نہیں ہوتا تو ناقص کیوں کریں سبحان اللہ کیا دنیا کے جتنے کام کامل ہوتے ہیں وہ اول ہی دن سے کامل ہوجاتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ مدت کے بعد عمدہ کام کرنا آتا ہے یہی حال اعمال آخرت میں بھی ہے کہ کرتے کرتے ہی کمال حاصل ہوجائیگا پس ناقص عمل بھی بیکار نہیں بلکہ یہ ذریعہ ہے کامل کا پس اعمال صالحہ میں خلوص کا قصد تو کرو لیکن اگر آج حاصل نہ ہو تو عمل نہ چھوڑ بیٹھو بلکہ کئے جاؤ اور قصد بھی برابر رکھو ان شاء اللہ ایک دن ضرور حاصل ہوجائیگا۔

کوتاہی اعمال کی ایک قسم

اس کے بعد کوتاہی اعمال کے اعتبار سے ایک اور تقسیم ہے وہ یہ کہ ایک کوتاہی تو یہ تھی کہ اعمال میں نفس کے حیلہ و بہانہ سے خود ہی مشغول نہیں ہوتے اور دوسری کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ خود اعمال میں مشغول بھی ہیں انہیں دوسروں کی فکر نہیں ہے وہ اپنے نوکروں، اپنے متعلقین کو بلکہ اپنے بچوں تک کو نماز پر مجبور نہیں کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب ہی آجکل مفقود ہے یاد رکھو جیسے طاعت خود واجب ہے ویسے ہی دوسروں کی طاعت کے لئے سعی بھی واجب ہے۔ مگر یہ سعی بقدر استطاعت واجب ہے جہاں زبان کی استطاعت ہو وہاں زبان سے کرے، جہاں ہاتھ پاؤں سے کرسکے ہاتھ پاؤں سے کرے، روپئے پیسے سے کرے خلاصہ یہ کہ محض اپنا عمل درست کرلینا کافی نہیں ہے دیکھئے قرآن میں جہاں

(۱) خالی الذہن ہو نہ یہ نیت نہ وہ نیت۔

اس امت کے فضائل بیان کئے گئے ہیں انمیں بطور خصوصیت کے اصلاح غیر کو بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی، یہ تو ہر شخص کے پاس اپنے لئے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ دوسروں کے نفع کے لئے ہیں کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے۔

دوسروں کی اصلاح کا اہتمام

اور مقتضا قواعد کا یہ تھا کہ یہاں ''تؤ منون باللّٰہ'' کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح غیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے۔ مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی بھی اصلاح واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عملی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہئے پھر دوسرے کی کرے یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں ایک کو بھی ترک کریگا تو اُس ایک کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کریگا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔ بعضے اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ﴿اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ وہ اس سے یہی سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے کیونکہ ہمزہ تأمرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے تو امر بالمنکر ہوا

یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر(۱) کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہئے اس آیت کا تو یہ جواب ہو گیا۔

تفسیر آیت میں غلط فہمی کا ازالہ

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنئے جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو۔ دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اسکا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے بس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا۔ اُن لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔ تو یہاں پر لم تقولون سے لم تنصحون غیر کم یا قول امری وانشائی مراد نہیں(۲) ہے بلکہ قول خبری واوعائی مراد ہے(۳) حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے باب(۴)

(۱) نیکی کا حکم (۲) غیروں کو نصیحت کرنا یا کسی کو نیکی اختیار کرنے کا حکم دینا مراد نہیں ہے (۳) بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی بات کیوں کہتے ہو یا ایسی بات کا دعویٰ کیوں کرتے جو تم کرتے نہیں (۴) یہ آیت دعویٰ کرنے کے بارے میں ہے دعوت و تبلیغ کے بارے میں نہیں ہے۔

میں نہیں اس کا شان نزول معلوم ہوجانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں(۱)۔غرض واجب تو دوسرے کی بھی اصلاح ہے مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اور باوجود اس کے حق تعالیٰ نے اصلاح غیر کو مہمل نہیں چھوڑا بلکہ جابجا نہایت اہتمام سے بلاقید تقدیم اصلاح خود کے اسکا امر فرمایا ہے اور وجہ اس کے اہتمام کی یہ ہے کہ اپنی اصلاح کو تو ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے کی اصلاح کا کچھ ایسا اہتمام نہیں کرتا اس لئے دوسرے کی اصلاح کے لئے زیادہ اس کے اہتمام کی ضرورت ہوئی اور اسی لئے آیت کنتم خیر امة میں اس کو اصلاح نفس سے پہلے ذکر کیا تا کہ اپنی اصلاح کے بعد دوسرے کی اصلاح سے بےفکر نہ ہوجاویں۔

اصلاح غیر کے درجات

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ ''اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ'' اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے افسوس اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہورہی ہے خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر کبھی بیوی بچوں کو نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے۔ بچے اگر امتحان میں فیل ہوجائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضا کردیں تو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت سے بےنمازی ہوگا تو اس کا سرپرست گناہگار ہوگا تو اگر

(۱) کوئی تعلق نہیں۔

اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ میں اَهْلِيْكُمْ کے کیا معنی ہوں گے اور دوسرا درجہ یہ ہے ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر و نہی کی تاکید ہے اسی طرح حدیث میں بھی تاکید ہے ارشاد ہے کلم راع و کلکم مسؤل عن رعیته یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جاویگا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر آخران آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے۔

کفار سے دوستی کا نقصان

مگر کیا کروں اس وقت ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنارہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کرکے آپ کو عبرت ہوگی ترجمہ یہ ہے کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہوجاؤ تاکہ سب برابر ہوجاویں جیسے ایک کبڑی سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کا کبڑا ہونا کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تاکہ میں بھی تو دوسروں کو اُس

نظر سے دیکھ لوں جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔ تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب اُنہیں کے برابر ہو جاؤ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ: فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ اُن سے دوستی اور اتحاد مت کرو کیونکہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر بننا پسند کرتے ہیں تو لامحالہ وہ تم سے مل کے اسی کی کوشش کریں گے افسوس مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ(۱) بھی نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بناویں اور وہ دل میں ہر وقت یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناویں صاحبو! برائے خدا تم اُن سے دوستی اور اتحاد مت کرو ہاں تھوڑی سی اتنی رعایت کرو کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں مگر افسوس کہ وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں کہ پرانے مسلمانوں کو بھی کافر بنادیں اور ہمیں اس کی بھی پروا نہیں کہ ہمارے جو بھائی پہلے سے مسلمان ہیں ان کو ہی اسلام کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔ صحابہ نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا آج ہم اپنی غفلت سے اُسے مٹا رہے ہیں۔

اسلام اخلاق سے پھیلا تلوار سے نہیں

بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اسلام بزور شمشیر(۲) پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے ہم اُس زور سے کام لے رہے ہیں مگر یہ بالکل ہی غلط ہے۔ دراصل شمشیر(۳) کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا یعنی حفاظت اسلام کے لئے تھا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے کہ بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے لئے شمشیر زنوں(۴) کی بھی تو ضرورت ہے تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے(۵) جمع ہوئے۔ جنہوں نے

(۱) خیال بھی نہیں آتا (۲) اسلام تلوار کے زور سے پھیلا (۳) تلوار (۴) تلوار چلانے والوں کی (۵) وہ تلوار چلانے والے کس تلوار کے زور سے جمع ہوئے۔

بزورِ شمشیر اسلام پھیلایا۔ دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول مقبول ﷺ کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے چنانچہ سیر وتواریخ اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہوجاویں تو سچ جانئے کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں مگر اب تو ہمارے اخلاق اس درجہ گر گئے ہیں کہ انہیں مثال میں پیش کر کے کفار کو نفرت دلائی جاتی ہے ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا کہ مسلمان ہوجا اُس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو ہونہیں سکتا جیسے بایزید ہیں کیونکہ اس پر قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو میں پسند نہیں کرتا اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔

مسلمان ہر حال میں کافر سے بہتر ہے

صاحبو! اُس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے کافر تو کسی طرح مسلمان سے اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتی کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحم دل کافر کو ظالم مسلمان سے بہتر وہی کہے گا جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ فرض کرو ایک شخص اعلیٰ درجہ کا ڈگری یافتہ ہے اور نہایت مہذب ہے مگر ہے حکومت کا باغی۔ اور ایک جاہل جرائم پیشہ اور چور ہے کہ سزا بھی پاتا ہے اور پکڑا بھی جاتا ہے مگر حکومت کا باغی نہیں بلکہ مطیع وفرمانبردار ہے میں اہل تمدن سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیں قانون کے اعتبار سے اور گورنمنٹ کی نظر میں کون شخص بڑھا ہوا ہے اور کون گھٹا ہوا ظاہر ہے کہ یہ جاہل گو اسمیں سارے عیب ہیں مگر ایک وصف فرمان برداری اس میں ایسا ہے کہ تھوڑے دنوں میں وہ سزا کے بعد پھر ویسا کا ویسا ہی مقبول ومقرب ہوجاویگا جیسا کہ جرم سے پہلے تھا اور یہ تعلیم یافتہ جسمیں ہزاروں خوبیاں ہیں بغاوت کی وجہ سے ہیچ در ہیچ ہے (۱) کیونکہ یہ ایسا عیب ہے کہ سب خوبیاں اُس کے سامنے ہیچ ہیں اسی لئے یہ ہمیشہ مبغوض اور معتوب رہے گا (۲) پس یہی فرق ظالم مسلمان اور رحم دل کافر میں خدا کے نزدیک ہے تو اب اگر کوئی

(۱) بہت ہی گھٹیا اور کم درجہ کا ہے (۲) اس پر ہمیشہ اللہ کا عتاب اور غضب ہوگا۔

شخص مسلمان ہوکر ایسا کہے کہ ظالم مسلمان سے رحم دل کافر اچھا ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ اسلام کو حق نہیں سمجھتا حیرت کی بات ہے کہ اسلام کو حق سمجھنے کے بعد یہ شبہ کرے کہ مسلمان سے کافر افضل ہوسکتا ہے بہرحال جب یہ مسلمان خدا کے نزدیک افضل ہے تو اس کافر کی یہ غلطی تھی جو اُس نے اپنے کفر کو اسلام پر ترجیح دی مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہے کہ دوسرا شخص ہمارے متعلق زبان پر یہ حرف لاسکے غرض ہماری حالت ایسی گری ہوئی ہے کہ کفار بھی ہم پر طعن کرتے ہیں۔

ہماری اخلاقی پستی

چنانچہ اُس حالت کا حاصل یہ ہے کہ اگر اخلاق بھی سیکھیں گے تو وہ بھی کفار سے لئے ہوئے جیسے حریت، مساوات، ایثار، ہمدردی، یہ سب الفاظ یورپ ہی سے سیکھے ہیں باقی جو دراصل ہمارے اخلاق ہیں ان کی تو گویا ضرورت ہی نہیں کہ داڑھی رکھیں نماز پڑھیں روزہ رکھیں استطاعت ہوتو زکوٰۃ دیں اور حج کریں اور معاملات ومعاشرات کو درست کریں اس پر مجھے اکبرالہ آبادی کا ایک شعر یاد آیا جو اس واقعہ پر کہا گیا ہے کہ جب انگریزی پڑھنے کو منع کیا گیا تھا تو جواب میں یہ کہا گیا تھا کہ واہ اس میں تو اسلام کی شان بڑھے گی کہ مسجد کا دروازہ پر جج اور کلکٹر دکھائی دیں گے۔ حالانکہ یہ سب حساب شیخ چلی کا سا تھا جس کو ایک بقال(۱) نے مزدوری پر گھی کا گھڑا سپرد کیا اور وہ گھڑا سر پر رکھ کر اُس کے ساتھ ہولئے اور یہ سوچنے لگے کہ مزدوری کا پیسہ ملے گا تو اس سے ایک انڈا خریدوں گا اور کسی کی مرغی کے نیچے رکھدوں گا اُس سے بچہ نکلے گا پھر اُس سے انڈے حاصل ہونگے پھر اُس کو اُن انڈوں پر بٹھادوں گا تو بہت سے بچے نکلیں گے تین چار بار ایسا ہی کروں گا جب زیادہ ہوجاویں گے تو سب کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا پھر گھوڑا پھر ہاتھی لوں گا اور پھر شادی

(۱) سبزی فروش۔

کروں گا اور بچے ہوں گے جب بچہ پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا ہشت (۱) آخر کا فقرہ آپ نے اتنے زور سے سوچا کہ گردن کو جھٹکا لگا اور گھی کا گھڑا سر سے گر گیا۔ مالک نے کہا کہ یہ کیا کیا آپ کہتے ہیں میاں جاؤ بھی میرا تو سارا کنبہ تباہ ہو گیا تمہیں اتنے سے گھی کی پڑی ہے۔ تو بہر حال اسی طرح انگریزی سے انہوں نے حساب لگایا تھا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام سے اور بعد (۲) ہو گیا سو اس معنی میں انہوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے تو خوشی پھر اسکی کیا ہے کوئی جنٹ ہے کوئی جج ہے

غرض یہ سب یورپ کی تقلید ہے کہ ایثار ہمدردی مساوات وغیرہ الفاظ یاد کر لئے اور وہ بھی محض نقل ہی نقل ہے اُن جیسے وہ بھی نہیں اور نماز روزہ حج زکوٰۃ اور داڑھی کی تو کچھ فکر ہی نہیں۔ اے صاحب اسلام پر اسلام کے طور سے نظر کرو، واللہ اگر ہم ویسے ہی مسلمان ہوتے جیسا اسلام چاہتا ہے تو ہمارے اقوال افعال اور احوال ہی کفار کے لئے ہادی ہو جاتے اور اگر ہادی نہ بھی ہوتے تو کم از کم ان کی عداوت تو ہم سے کم ہو جاتی۔ ہمارے اسلام کے تو یہ کارنامے تھے کہ غیر قومیں ان میں خود بخود جذب ہوتی تھیں اگر تم غیر قوموں کو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے بھائیوں کو تو ان میں جذب ہونے اور گرنے سے تھام لو۔ بس اب تو وہ حالت ہے کہ ؎

اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست گیرم کہ غمت نیست غم ما ہم نیست

تبلیغ دین کی ضرورت

ہم نے مانا کہ تمہیں غیر قوموں سے خود اپنا اندیشہ نہیں مگر اپنے بھائیوں کا تو غم ہونا چاہئے کہ غیر قومیں ان کو تباہ کر رہی ہیں اس معاملہ میں ایک بڑی کوتاہی یہ بھی معلوم ہوئی کہ برسوں سے حق بات اپنے بھائیوں تک پہنچائی ہی نہیں گئی۔ چنانچہ سننے میں آیا ہے کہ جب مبلغین محل ارتداد (۳) میں پہنچے تو اُن لوگوں نے یہ کہا کہ ہم نے دس بارہ

(۱) پرے ہٹو (۲) اور دوری ہو گئی (۳) جب مبلغین اس جگہ پہنچے جہاں بہت سے لوگ مرتد ہو کر اسلام سے پھر گئے تھے۔

برس میں آج عالم کی صورت دیکھی ہے اگرچہ ہم ساری دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر پھر بھی ہمیں چاہئے جتنا ہم سے ہوسکے کوشش تو کریں کیونکہ اس کی ہم سے پوچھ ہوگی اور کامیابی یا ناکامی پر ہمیں توجہ نہ کرنا چاہئے کیونکہ ہم سے اس کی پوچھ نہیں ہوگی۔

مبلغین کا کام

جناب رسول مقبول ﷺ بھی چاہتے تھے کہ دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہے اور حق تعالیٰ نے آپ کو خاص طور پر اسی کام کے لئے بھیجا بھی تھا اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا مگر باوجود اس کے صاف فرمادیا گیا کہ آپ سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تمہارے زمانہ کے کچھ لوگ دوزخی کیوں ہوئے ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ شاید آپ (ان کفار کے پیچھے) اپنی جان کھپادیں گے اور ایک جگہ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ حاصل یہ کہ آپ (ان کے ایمان نہ لانے پر) غمگین نہ ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گو آپ کا یہ فرض منصبی نہ تھا کہ آپ اس قدر بلیغ کوشش فرماویں مگر آپ اپنی طبعی رحمت و شفقت کے تقاضہ سے یہ چاہتے تھے کہ ایک بھی دوزخی نہ رہے اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو آپ کو صدمہ ہوتا تھا اس صدمہ کے دفع کرنے کے لئے یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ اس کی کچھ فکر نہ کریں نہ آپ اپنی جان کھپائیں۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اگر آپ کا رب چاہتا تو سب کو ہدایت ہوجاتی اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرسکتے ہیں؟ استفہام انکار کے لئے ہے یعنی آپ کا کام کوشش کرنا ہے اور کوشش پر پھر خدا جسے توفیق دیگا ایمان لے آویگا، آپ مجبور کیوں کرتے ہیں کوئی شخص بغیر خدا کے حکم کے مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوشش کے معنی یہ نہیں کہ ثمرہ ضرور مرتب ہو مثلاً مرتدین (۱) کو

(۱) جو لوگ دین سے پھر کر بے دین ہو رہے ہیں

تبلیغ کریں تو وہ ارتداد(۱) سے بچ ہی جاویں بلکہ کوشش کے معنی یہ ہیں کہ جو کام تمہارے قبضہ میں ہے وہ کر ڈالو ان کو سمجھاؤ بجھاؤ اسلام کے محاسن بتلاؤ۔ بس اس طرح کوشش کرو اگر خدانخواستہ پھر بھی ناکامی ہو تو رنج مت کرو کیونکہ تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے۔ یہ بھی ایک مرض ہے نفس کا کہ اس کو اپنی بات کا رائگاں جانا ناگوار ہوتا ہے اس وقت میں اُسی کا علاج کر رہا ہوں اور ان آیتوں کا حاصل بھی یہی ہے۔

کوشش کے درجات

خلاصہ یہ کہ کوشش کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں ایک تو یہ کہ کوشش ہی نہ کرے، ایک یہ کہ ایسی کوشش کرے کہ اگر ناکامی ہو تو گھل گھل کے جان دیدے۔ یہ دونوں درجے غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں اس میں دو راز ہیں۔

ایک یہ کہ دوسرے کے فعل پر قدرت نہیں اُس پر رنجیدہ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ہمارے قبضہ کی بات تھی مگر نہیں ہوئی۔

اور دوسرا امر ذرا باریک ہے(۲) وہ یہ کہ یہ بتاؤ کہ دین کس کا ہے؟ خدا کا، تو اس کی حفاظت خدا کا وعدہ ہے۔ پھر تمہارے رنج کا منشا یہ ہے کہ اگر ناکامی کی یہی رفتار رہی تو خدانخواستہ ایک دن اسلام مٹ جاوے گا اور وعدہ صحیح نہ رہے گا تو یہ منشا ہی غلط ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۳) پر اعتماد نہیں رہا۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی مٹ نہیں سکتا کیونکہ اس کے محافظ تو خود وہ ہیں جو تمہارے بھی محافظ ہیں۔ اب شاید یہ کہو گے کہ پھر ہمیں کوشش کرنے کو کیوں کہا گیا۔ سو اس لئے کہا گیا تاکہ تم کو ثواب ہو اور اجر ملے تمہارا تعلق دین سے ظاہر ہو محبت کے آثار نمایاں ہوں یہ تو ان کی کمال عنایت و رحمت ہے کہ انہوں نے تمہارے ثواب کے لئے ایک بہانہ بتلا دیا ہے باقی ثمرہ تو اُن ہی کا تصرف ہے ۔

(۱) لادینی اختیار کرنے سے بچ ہی جائیں (۲) دوسری بات ذرا دقیق ہے (۳) ہم نے قرآن نازل کیا ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوی چین بستہ اند(۱)

بس تمہاری نیک نامی کے واسطے بظاہر تمہارے متعلق یہ کام کر دیا ہے کہ تم ذرا سی کوشش کر کے مقبول ہو جاؤ گے ورنہ کام تو وہ خود کرتے ہیں وہی محافظ ہیں اس لئے غم کبھی نہیں کرنا چاہئے۔

اور ان دو رازوں کے علاوہ تیسری خرابی اس کاوش میں یہ ہے کہ اس غم کی وجہ سے طبیعت سست ہو جاتی ہے اور اس سے رفتہ رفتہ کوشش سے معطل و بیکار ہو جاتا ہے(۲) تو جو منشا تھا غم کا یعنی ناکامی وہ اور اچھی طرح واقع ہوتی ہے اور شریعت کا مقتضا یہ ہے کہ مسلمان سست نہ ہونے پاویں اس لئے زیادہ رنج مناسب نہیں اور گو رنج کے موقع پر رنج کو منع کرنے سے ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ تو شفقت کی کمی کی تعلیم معلوم ہوتی ہے مگر راز اس میں یہ ہے کہ جب ایسی چیزوں کا غم کرو گے جو تمہارے قبضہ میں نہیں ہیں تو خواہ مخواہ سست ہو جاؤ گے اور اس سے اصل کام میں خلل واقع ہوگا تو خلل کو گوارا کرنا یہ ہے شفقت کی کمی اور کام کا جاری رکھنا تو عین شفقت ہے۔

تبلیغ کرنے میں اعتدال کا اہتمام

غرض اعتدال کے ساتھ کام کئے جاؤ اور اس کام کو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے ﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی و لطافت سے اللہ کی سبیل(۳) کی طرف بلاؤ اور راہ راست پر لاؤ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہئے یعنی

(۱) تیری زلفوں کی خوشبو تو خود ہی پھیلی ہوئی ہے عاشق تو صرف اپنی ناموری کی خاطر اس کا ذکر کر رہے ہیں

(۲) کام کرنا چھوڑ دیتا ہے (۳) راہ خدا کی طرف بلاؤ۔

مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں پر قائم کر دئے جاویں ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو اُسے اختیار کرنا چاہیے بس یہ تو ہمارا کام ہے اسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔ ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا۔

خوشی کے دو درجے

اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ تو نازمت کرو جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کا مصداق ہوتی ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے وہ اعتدال سے باہر ہے، نہ ناکامی میں حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں۔ پس سنئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کے حالت کے متعلق دو ارشاد ہیں: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہئے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے: ﴿لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ بہت مت خوش ہو خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہئے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل ان میں تعارض نہیں بلکہ یہ دو حالتیں جدا جدا ہیں جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ ایک خوشی اضطراری ہے(۱) جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپئے یا اشرفیوں کی کھوگئی۔ جس سے آپ بہت پریشان ہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں(۲) کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعۃً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی ایک خوشی تو اُس وقت ہے یہ اضطراری اور بے

(۱) غیر اختیاری خوشی (۲) پریشان ہو گئے۔

اختیاری خوشی ہوگی۔ اور ایک یہ صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بیچاروں نے ڈر کے مارے لاکر دے دی ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے، اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی بلکہ شکر کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کھوئی ہوئی چیز مل گئی، اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز وتکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ یہ ہمیانی کیسے ملتی، تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم (۱) اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا کہ ہم نے یوں کیا تو کیا اچھا اثر ہوا یہ مذموم ہے۔ بہرحال ہم کو کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہئے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہئے کام شروع کردو اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

یعنی جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مسبع میں (۲) بند کیا تھا تو اس وقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے حالانکہ محل کے ساتھ دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل (۳) ڈال دئے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا مگر چونکہ نبی تھے اس لئے آپ نے یہ سمجھا کہ گو دروازے مقفل ہیں مگر جتنا میرا کام ہے وہ تو میں کروں کم از کم دروازے تک تو بھاگوں چنانچہ بھاگے اب جس دروزہ کے پاس پہنچتے تھے قفل خود بخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید (۴)

(۱) پہلی پسندیدہ دوسری ناپسندیدہ (۲) محل کے سات دروازوں کے اندر لیجا کر بند کیا (۳) تالے ڈالدئے تھے (۴) اگرچہ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن جب یوسف علیہ السلام اللہ پر بھروسہ کرکے بھاگے تو راستہ بنتا چلا گیا۔

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے اسی کے فضل سے سب کچھ ہوگا پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ارتداد سے بچ گئے تو نازمت کرنا بلکہ شکر کرنا۔ غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے دوسرے یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لزوماً مرتب سمجھے۔ جیسے سودا نے اُن لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے جو خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ میاں تم نے کیسا کام کیا جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھوسکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

کوشش کے لئے استطاعت شرط ہے

مگر اس کوشش کے لئے ایک شرط بھی ہے یعنی استطاعت (۱)۔ اور یہ سب کچھ میں اُن ہی کاموں کے لئے بیان کررہا ہوں جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پر اجر اور دوسرے احکام ایسے ہی کاموں کے لئے ہیں۔ اور ایک وہ کام ہیں جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت واستطاعت سے (۲) باہر ہیں ان کے لئے کوشش کرنا فضول ہے نہ مامور بہ (۳) ہیں اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر ہے مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لئے آسمان کی طرف ہر روز کودا کرے اور یہ سمجھے کہ اگر کبھی گر کے مروں گا تو شہید مرونگا تو یہ محض خبط ہے کیونکہ یہ فعل اس کی قدرت واستطاعت سے باہر ہے اس لئے اس پر بجائے اجر کے باز پرس ہوگی حدیث شریف میں ہے کہ لا ینبغی للمومن ان یذل نفسہ یعنی مومن کو مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ مومن اپنے کو کس طرح ذلیل کرتا ہے آپ نے فرمایا یتحمل من البلاء لمالا یطیقہ ایسی بلا اپنے ذمہ لے لے

(۱) قدرت کا ہونا (۲) جو ہماری قدرت وطاقت میں نہیں (۳) نہ کوشش کرنے کا حکم دیا گیا۔

جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ جہاں جہاں یہ خطرۂ ارتداد رونما ہے کوشش سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہاں جانا اور تبلیغ کرنا حسًا وقانوناً آپ کی قدرت میں ہے یا نہیں اسی طرح یہ بھی دیکھو کہ اس میں چندہ دینا حسًا یا قانوناً کوئی جرم تو نہیں جب ان باتوں کا اطمینان ہوجاوے تو پھر یہ متعارف تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں اور اس کے بعد نتیجہ سے کچھ بحث نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ دوسرے کا فعل ہے اور قادر بقدرت غیر، قادر نہیں ہوتا(۱) ایسی غیر مقدور چیز کے پیچھے پڑنا محض غلو ہے، جس کی اسلام کو حاجت نہیں اب تو دو چار ہزار کے ارتداد کی خبر ہے میں کہتا ہوں کہ اگر پندرہ بیس لاکھ بھی خدانخواستہ مرتد ہوجاویں تو اسلام میں کچھ کمی نہیں آسکتی۔

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد(۲)

اگر کوئی کوشش کے متعلق یہ کہے کہ جب اللہ میاں ہی دین کی حفاظت کریں گے تو ہمیں کوشش کرنے کی کیا ضرورت۔ ہاں تو پھر قرآن بھی حفظ مت کیا کرو کیونکہ انہوں نے اُس کی حفاظت کا تو خاص طور پر وعدہ کیا ہے اللہ میاں کی حفاظت کا مطلب یہی تو ہے کہ ہمیں حفظ کرنے کا حکم دیا ہے تو ہمیں اُس پر عمل کرنا چاہئے پس یہ سب حفاظت میں داخل ہے۔

جاہلانہ سوچ

اس حفظ کرنے پر ایک لطیفہ یاد آیا بعض فرقوں کو حفظ قرآن کی توفیق نہیں ہوتی اُن میں سے کانپور میں ایک شخص کا یہ مقولہ سنا تھا کہ ہم اس واسطے قرآن حفظ نہیں کرتے تاکہ ہم اور اللہ میاں برابر نہ ہوجائیں کیونکہ وہ بھی حافظ ہیں اور اگر ہم بھی حافظ ہوجاتے تو نعوذ باللہ ان کے برابر ہوجاتے ہیں میں نے کہا کہ وہ تمہارا ہی خدا ہوگا جس کے برابر ہر حافظ ہوسکے۔ ہمارے خدا کے برابر تو کوئی نہیں ہوسکتا چاہے

(۱) جو کسی کام کو کرنے میں دوسرے کا محتاج ہو اس کو قادر نہیں کہتے (۲) جس چراغ کو اللہ تعالیٰ جلانا چاہے وہ ضرور روشن ہوگا جو اس کو بجھانے کے لئے پھونکے ماریگا اس کی داڑھی جل جائیگی۔

کوئی کتنا ہی کمال حاصل کرلے پھر اگر اس خیال سے حفظ قرآن ترک کیا گیا ہے تو علم کو بھی ترک کیا ہوتا تاکہ مساوات لازم نہ آوے کیونکہ ہم جاہل ہیں اور اللہ میاں عالم تو ہم علم نہ حاصل کریں تاکہ ان کی برابری لازم نہ آئے۔ مہمل اور لغو باتیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ نعوذ باللہ، اللہ میاں ہمارے بڑا بنانے سے بڑے بنے ہوئے ہیں۔ بلکہ حق تعالیٰ کی اس صفت پر نظر کرکے تو اور زیادہ حفظ کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ تخلق باخلاق الٰہیہ نصیب ہو (۱) چنانچہ اللہ میاں نے اپنی تقلید واتباع کا بعض افعال میں حکم بھی دیا ہے فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ یعنی اللہ اور اس کے فرشتے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں پس اے مومنوں تم بھی درود بھیجو اب یہاں کہو کیا کہتے ہو کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب اللہ میاں درود بھیجتے ہیں تو ہم کیوں بھیجیں اس میں تو برابری ہوگی بلکہ یہی کہو گے کہ اب تو ہمیں اور زیادہ صلوۃ وسلام کا ورد کرنا چاہئے جب اللہ میاں آپ کی اتنی عظمت ظاہر فرماتے ہیں تو ہم کس شمار میں ہیں۔

ہماری ذمہ داری

اس پر مجھے وطن کا اپنے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا کہ ہمارے والد باوجود ثروت ودولت کے منکسر المزاج بہت تھے۔ ایک مرتبہ برسات کے موسم میں کھر پالیکر وہ خود ہی چھت پر گھانس چھیلنے کو جانے لگے اور مجھ سے فرمایا تم بھی چلو تائی صاحبہ نے فرمایا جوان بیٹے سے ایسا کام نہیں لیا کرتے انہوں نے مان لیا اور تنہا خود چھت پر چڑھ گئے اس وقت تائی صاحبہ نے کہا کہ جب تمہارے باپ گھانس چھیلنے گئے ہیں تو اب تمہیں بھی ضرور جانا چاہئے تو اسی طرح یہاں سمجھو کہ محافظت اسلام کا کام جب اللہ میاں خود کرتے ہیں تو بندہ کو ضرور کرنا چاہئے اور اگر اس شخص کی بیہودہ بات مان لی جاوے تو لازم

(۱) تاکہ صفات الٰہیہ سے ہم متصف ہوں۔

آوے گا کہ کوئی اچھی بات نہ کریں کیونکہ وہ تو اللہ میاں بھی کرتے ہیں بس سب برائیاں ہی برائیاں کرنا چاہئیں کیونکہ وہ اللہ میاں نہیں کرتے۔ نعوذ باللہ خدا کی پناہ ہے ایسی جہالت سے بس یہ بندہ کو سمجھنا چاہئے کہ جب ہمارا کام وہ خود بھی کرتے ہیں تو ہم خود کیوں نہ کریں مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نہ کریں گے تو یہ کام اٹکا پڑا رہے گا ہرگز نہیں وہ فرماتے ہیں: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ﴾ یعنی اگر تم اسلام کی حفاظت و خدمت نہ کروگے تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو قائم کردیں گے جو تمہاری سی (نافرمان) نہ ہوگی۔ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں۔ باقی اس عالم امتحان میں ان کی عادت یہ ہے کہ وہ ہمارے کام کسی ظاہری واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور یہ ہماری سعادت ہے کہ ہم ان کاموں کا واسطہ بنیں۔

مرتدین کو تبلیغ کرنے کا اہتمام

بہرحال اس وقت یہ قصے اسلام کے مٹانے کے دوسری قوموں کی طرف سے پیش آرہے ہیں جس کی سب مسلمانوں کو مجتمع ہوکر مدافعت کی کوشش کرنا چاہئے یہاں کانپور میں بھی چند باحمیت مسلمانوں نے اس کام کا ارادہ کیا ہے مگر اس کے لئے سامان وسرمایہ کی ضرورت ہے تاکہ مبلغین اُس سرمایہ سے وہاں جاویں اور اسلام سے اعدائے دین(۱) کی تہمتوں کو ہٹاویں اور چونکہ اس قسم کے کام میں عادۃ اللہ یہ ہے کہ اکثر غرباء ہی کے ہاتھوں کی برکت سے انجام پاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اگر چندہ کیا جاوے تو اس میں ان کو بھی شریک کریں۔ نیز جو لوگ خود جاکر تبلیغ نہیں کرسکتے وہ اپنے پیسے ہی کو اپنا قائم مقام کردیں اور اس میں قلیل و کثیر سے مت شرماؤ، اللہ تعالیٰ کے یہاں اُسکی دیکھ بھال نہیں ہے کہ کس کے روپئے زیادہ ہیں۔ وہاں تو نیت اور خلوص کی

(۱) دین کے دشمنوں کے اعتراضات دور کریں۔

دیکھ بھال ہے ممکن ہے کہ تمہارے خلوص کی بدولت ایسی کامیابی ہوجاوے کہ آئندہ اس کوشش ہی کی ضرورت نہ ہو مگر میرے نزدیک یہ کام اتنا ضروری ہے کہ بطور حفظ ماتقدم کے اسے ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے کیونکہ مسلمانوں میں بعض جگہ اس قدر جہالت بڑھی ہوئی ہے کہ مردے تک بلا نماز جنازہ کے دفن کردیتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نام کے مسلمان نہیں ہوتے جیسے یہ لوگ ہیں جن میں ارتداد کا اندیشہ ہے۔ تاہم احکام کی تبلیغ اور تعلیم نہ ہونے سے انہیں بھی کچھ خبر نہیں۔

نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام

مجھے نام کے مسلمانوں پر یہیں نواح کانپور میں موضع گجنیر کا ایک واقعہ یاد آیا میں نے وہاں جاکر خود دیکھا کہ وہ برائے نام ہی مسلمان ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ میاں تم کون لوگ ہو مسلمان ہو کہنے لگے ہم کیوں ہوتے مسلمان میں نے کہا اچھا تو ہندو ہو کہنے لگے ہم کیوں ہندو ہوتے ؎

از مذہب من گبرو مسلمان گلہ دارد(۱)

میں نے کہا آخر پھر کیا ہو کہنے لگے ہم نومسلم ہیں۔ گویا اُن کے خیال میں نومسلم ہندو اور مسلمان کے درمیان میں تیسری قسم ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ وہاں کے زمیندار سے ملے اور انہیں شربت دیا گیا تو نہیں پیا کہ مسلمان کے ہاتھ کا شربت پینے سے ہم اپنی برادری میں بدنام ہوجاوینگے۔ ایک مرتبہ ایک مبلغ کو وہاں ایک گاؤں میں بھیجا چونکہ اُن لوگوں سے روٹی تک دینے کی امید نہ تھی اس لئے ان مبلغ سے کہا گیا کہ بھئی ستو باندکر لیجاؤ تو اُن لوگوں نے ستو گھولنے کے لئے اپنے برتن تک نہ دئے ان بیچاروں نے رومال پر ستو رکھ کر اُس پر پانی چھڑک کر تب

(۱) میرے مذہب سے تو آتش پرستوں اور مسلمانوں دونوں ہی کو شکایت ہے۔

کھایا۔ اور دراصل یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم لوگوں کو نومسلموں کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں ہے شہروں میں مدرسے بھی ہیں یتیم خانے بھی ہیں سب کچھ ہے مگر کوئی نومسلم خانہ نہیں ہے اگر کبھی کسی کو مسلمان بھی کیا تو بڑی بڑائی یہ کی کہ اُسے ایک پرچہ لکھ کر دے دیا کہ جا بھئی مانگ اور کھا۔ اگر ایسا ہوتا کہ کم از کم چھ مہینے تو اُس کو اپنے پاس رکھتے اور ضروری عقائد اور ضروری اعمال نماز روزہ وغیرہ سکھاتے تو کیسا اچھا ہوتا مگر اس کا ذرا بھی اہتمام نہیں۔ اب تو بس مسلمان بنا کر سانڈ کی طرح چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح کے یہ لوگ بھی معلوم ہوتے ہیں کہ ان کو بھی کسی نے یوں ہی مسلمان بنا کر چھوڑ دیا ہے ان کو کبھی تعلیم وتلقین نہیں کی گئی اور نہ اُس کے بعد پھر کوئی انکا پرسان حال ہوا نہ کوئی واعظ ان کے پاس گیا کیونکہ ہم لوگ جہاں پلاؤ قورمہ کی امید ہوتی ہے وہاں تو خوب دوڑ کر جاتے ہیں اور ایسی جگہ جہاں ستو گھول کے کھانا پڑے جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

تبلیغ کے لئے مبلغین علماء کی جماعتیں بنانے کی ضرورت

بہرحال انتظام کے ساتھ ایک جماعت قائم کرکے وہاں ہم کو جانا چاہئے اور کام کرنا چاہئے اگر یہ طریقہ تبلیغ واشاعت کا ہندوستان میں جاری ہوجاوے تو پھر اسے امریکہ اور یورپ تک وسعت دینی چاہئے اور وہاں بھی اپنے مبلغین بھیجنا چاہئے مگر پہلے ہی دن بہت اونچے نہ اڑو اول ہندوستان کی تو خبر لو۔ بہرحال یہ بہت ضروری کام ہے۔

تربیت ملبغین اور ان کی کفالت

اب اس میں چند کوتاہیاں اور بھی ہوتی ہیں ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے ایک یہ کہ بسا اوقات جو مبلغ ہوتے ہیں خود ان کی حالت درست نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ جب استاد ہی ناقص ہوگا تو شاگرد تو اور بھی انقص ہوگا، تو سب سے پہلے مبلغ کو اپنے عمل کی اصلاح ضروری ہے تاکہ ان پر اثر

اچھا پڑے۔ یہ خطا تو اہل علم کی ہی تھی اب ایک خطا اور کوتاہی عوام کی ہے وہ یہ کہ انکا کام سرمایہ جمع کرنا تھا پھر مولوی اُس سرمایہ سے سفر کرتے اور پھر چونکہ انکے ساتھ اپنی ضروریات بھی تھیں۔ مثلا وہاں تبلیغ کے لئے جائیں تو اپنے پیٹ کو کہاں رکھ کر آویں بیوی بچوں کو کیا کریں اس لئے ضرورت تھی سرمایہ سے ان کی مدد کی جاتی تا کہ یہ بیفکری سے کام کرسکیں مگر عوام کو اسکا احساس ہی نہیں ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے ارے صاحب یہ ساری خطا مولویوں کی ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کی کبھی خبر نہ لی۔ میں نے کہا پہلے تو تمہاری خطا ہے کہ تم نے سرمایہ جمع کر کے ان کو نہیں دیا۔ آخر مولوی کام کریں تو بیچارے کہاں سے کریں۔ اسمیں سرمایہ ہی تو بلی کی میاؤں ہے۔ لیکن عوام کے ساتھ اس میں تھوڑا سا قصور مبلغین کا بھی ہے وہ یہ کہ جہاں سرمایہ کا انتظام بھی ہوا ہے وہاں بیدریغ روپیہ اڑا ڈالتے ہیں مثلاً خود اپنے پیسے سے چاہے تھرڈ میں بھی سفر نہ کریں گے مگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے کہ اب سکنڈ سے کم میں نہیں بیٹھ سکتے۔ بہرحال ان سب کوتاہیوں سے احتیاط کر کے سرمایہ ضرور جمع کریں۔ سرمایہ ہی اصلی چیز ہے بدون اس کے نری تجویز ایسی بیکار ہے جیسے ایک دفعہ بہت سے چوہے جمع ہوئے انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ کوئی تدبیر ایسی ہوسکتی ہے کہ بلی کو پکڑ لیں کیونکہ یہ ہم کو بہت جانی نقصان پہنچاتی ہے چنانچہ مشورہ ہونے لگا انہوں نے کہا کہ سب مل کے ایک ایک عضو کو پکڑ لینا ایک نے کہا میں ہاتھ پکڑلوں گا ایک بولا میں ٹانگ پکڑلوں گا کسی نے گردن پکڑنے کو کہا وعلی ہذا وہاں ایک بڈھا چوہا بھی تھا وہ کچھ نہیں بولا جب اُس سے پوچھا گیا کہ تم کیوں نہیں بولتے اُس نے کہا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سب کچھ تو تم پکڑلوگے مگر اس کی میاؤں کو کون پکڑے گا۔ جس وقت وہ میاؤں کرے گی سب بھاگ جاؤ گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دو حکایتیں

ایک اور قصہ ہے کہ ایک قصائی مرگیا تھا اس کی بیوی برادری کے سامنے اپنے خاوند کو یاد کر کے رونے لگی کہ ہائے اب اس کی دکان کو کون چلائیگا، تو ایک صاحب بولے میں چلاؤں گا میں ۔ ہائے اس کے کپڑوں کو کون پہنے گا، وہی بولا میں پہنوں گا میں۔ کہا ہائے اس کی چھریاں کون لے گا، وہ بولا میں لوں گا میں۔ اُس نے کہا ہائے اس کا قرضہ کون ادا کریگا، تو کہنے لگا بولو بھئی اب کس کی باری ہے کیا سب کام میں اکیلا ہی کروں۔

اور نیز مثال ہے کہ دو رفیق کسی سفر میں ہمراہ ہوئے کہیں منزل پر ٹھہرے تو ایک رفیق نے کہا کہ بھئی کنویں سے پانی میں بھروں۔ لکڑی تم جنگل سے لے آؤ۔ اُس نے کہا بھئی مجھ سے کچھ نہ ہوگا خیر اُس نے خود ہی دونوں کام کر لئے اب کہا مسالہ تم پیس لو کھانا میں پکاؤں گا، کہنے لگا یہ بھی مجھ سے نہ ہوگا اُس نے یہ بھی کرلیا اب جب کھانا پک گیا تو اُس نے کہا کہ اچھا آؤ کھاتو لو کہنے لگے اب ہر بات میں تمہاری کہاں تک مخالفت کروں لاؤ کھاتو لوں۔ تو ایسے ہی جنٹلمین بھی چاہتے ہیں کہ سب کام تو مولوی کرلائیں اور یہ خالی حکومت کرنے کو بیٹھے رہے۔

چندہ جمع کرنا علماء کا کام نہیں

دیکھو سارا کام سرمایہ کا ہے اور سرمایہ جمع کرنا مولویوں کا کام نہیں بلکہ اُس شخص کا کام ہے جو پچاس روپیہ اپنے پاس سے دے تب پانچ روپیہ چندہ کی تحریک دوسروں سے کرے غرض مولویوں کا کام سرمایہ جمع کرنا نہیں مولویوں کا کام وعظ کہنا ہے اور اور رؤساء کا کام ہے چندہ جمع کرنا پھر دونوں مل کر کام میں لگیں، کام تو اسی طرح ہوتا ہے باقی باتیں بنانا سب کو آتی ہیں۔

چندہ جمع کرنے کا طریقہ

سب سے پہلے بڑے لوگوں کو سرمایہ جمع کرنے کے لئے اُٹھنا چاہئے لیکن ان کے چندہ جمع کرنے میں ایک اور مصیبت ہے وہ یہ کہ چندہ جمع کرنے کون اکٹھے ہوئے منصف صاحب، جج صاحب، ڈپٹی کلکٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانہ دار صاحب تو لوگ انہیں تو مارے ڈر کے چندہ دینگے کہ کہیں یہ عدالت میں کسر نہ نکالیں مقدمہ نہ خراب کردیں کبھی یہ ہوتا ہے کہ جتنا آزادی میں خوشی سے دیتے اب ان کے دباؤ سے اُس سے بہت زیادہ دیں گے۔ یاد رکھو اس طرح سے چندہ لینا بالکل حرام ہے۔ مناسب یہ ہے کہ رؤساء میں جو اہل حکومت ہیں وہ چندہ نہ کریں بلکہ ذی وجاہت لوگ جن کا حکومت میں بالکل دخل نہیں ہے چندہ کریں۔ ہاں اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص ان اہل حکومت سے اتنا بے تکلف ہو کہ صاف انکار بھی کرسکے تو ایسے لوگوں کا چندہ اہل حکومت بھی لے لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مبلغین کی کوتاہی

اور ایک کوتاہی بعض مبلغین کی (جیسا اوپر مذکور ہوا اور اب مکرر ایک اور مضمون کی تمہید کے لئے بیان کرتا ہوں) یہ ہے کہ وہ چندہ میں اسراف بہت کرتے ہیں سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور جو کام خط سے نکل سکتا ہے اُس کے لئے تار پر تار جارہے ہیں۔ اسٹیشن پر برف لیمنڈ (۱) بھی پی رہے ہیں چائے بسکٹ بھی اڑ رہا ہے چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے ہوں مگر چندہ کا پیسہ ایسی بیدردی سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سن کر بہت رنج ہوتا ہے کہ یا اللہ ان پر علم کا کیسا الٹا اثر ہوا علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہئے یہ طریقے تو لیڈروں ہی کے واسطے چھوڑ دینے چاہئیں۔

(۱) ٹھنڈی بوتلیں پی جارہی ہیں۔

چندہ شدہ رقم کی حفاظت اور خرچ میں احتیاط

اب اس پر ایک تفرع (۱) کرتا ہوں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو چندہ کے روپئے کا درد نہیں رکھتے تو اب مسلمانوں کو دو کام اور بھی کرنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ چندہ ایسے شخص کے پاس جمع کرنا چاہئے جس پر خیانت کا احتمال نہ ہو دوسرے یہ کہ چندہ صرف ایسے شخص کے مشورہ سے ہونا چاہئے جو متقی اور عالم ہو۔ مسائل فقہیہ شرعیہ کا ماہر ہو۔ اور وہ ایسا ہو کہ سب اُسی کے تابع ہوں۔ یہ بات اصول شرع واسلام سے ہے کہ کام دراصل ایک ہی شخص کی رائے سے ہوتا ہے اور اپنی اعانت کے لئے وہ دوسروں کی بھی رائے لے لیتا ہے اُس مشورہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ معاملہ کے سب پہلو اُسے مستحضر (۲) ہوجاتے ہیں جب سب پہلو نظر میں آجاویں تو اس کا کام یہ ہے کہ ان میں سے جو پہلو خود انتخاب کرے اُسی کا حکم دیدے یہ ہی طریق مشروع و معقول ہے مگر اب یہ حالت ہورہی ہے کہ اگر کسی کام کے لئے انتخاب کریں گے تو اُسے جو خود مالدار ہو، اور اس کے ذریعہ سے چندہ خوب آسکتا ہو ایسے شخص کو چندہ جمع کرنے کے کام پر مقرر کرنا تو مضائقہ نہیں مگر سارے کام اُسی کے سپرد کردینا خواہ وہ نرا جاہل ہی ہو حماقت اور بیوقوفی ہے۔ انتخاب اُس شخص کا کرنا چاہئے جو طامع (۳) نہ ہو کسی سے ڈرتا نہ ہو عالم ہو متقی ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشورہ

چنانچہ میں نے اُس جماعت کو جو یہاں کام کرنے کے لئے امادہ ہوئی ہے یہی رائے دی ہے اب اُن میں آپس میں میرا یہ مشورہ پیش ہوگا۔ پھر جیسا طے ہو عمل کیا جاویگا لیکن جب تک کوئی مستقل تحویلدار (۴) منتخب ہو کام تو نہ بند رکھنا چاہئے۔ اس کے متعلق

(۱) ایک مسئلہ بیان کرتا ہوں (۲) تمام پہلو اس کے سامنے آجاتے ہیں (۳) لالچی نہ ہو (۴) جب تک کوئی ایسا آدمی ملے جس کو خزانچی بنایا جائے۔

میں نے یہ رائے پیش کی ہے کہ اس وقت تک کے لئے ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو تحویلدار مقرر کردیا جاوے۔ چنانچہ انہوں نے چندہ جمع کرنے کا اہتمام شروع کردیا ہے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہدیا ہے کہ رسیدیں بھی چھپوالی جاویں اور جب تک رسیدیں چھپ کر تیار ہوں محصل چندہ سادہ کاغذ پر یادداشت لکھ کر اہل عطا کو دیدیا کرے اور کہدے کہ فلاں تاریخ تک باقاعدہ چھپی ہوئی رسیدیں آجائیں گی اس وقت آکر اسے بدل لیجانا یہ سب تو میری تنہا رائے ہے اب یہاں کارکنوں کی جو مرضی ہو وہ کریں پھر اس کے بعد جو کام جتنا جس سے ہوسکے وہ اس کام میں شرکت کرے اگر کسی کے پاس علم اور روپیہ بھی نہیں ہے تو زبان تو ہے اسی سے کام کرو یعنی لوگوں کو اس کام کی رغبت دلاؤ

لا خیل عندك تهدیها ولا مال فلیسعد النطق ان لم لیسعد الحال (۱)

غرض پہلے تو جان سے خدمت کرو۔ یعنی وہاں جا کر تبلیغ کرو اگر یہ نہ کرسکو تو روپیہ پیسہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مال سے خدمت کرو اگر اس کی بھی وسعت نہ ہو تو زبان سے خدمت کرو۔ وہ یہ کہ اپنے اہل وسعت دوستوں اور عزیزوں سے کہو اگر اُن سے بھی کہنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اللہ میاں سے کہو یعنی دعا کرو کہ اے اللہ مسلمانوں پر فضل فرمایئے اور اسلام کی نصرت فرمایئے۔ حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کردیجئے اگرچہ میں نے یہ کام بتایا سب مضامین سے آخر میں مگر ہے یہ سب سے بڑا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جب یہ سب سے بڑا ہے تو پھر اس کے ہوتے ہوئے اور سب کام چھوڑ دئے جاویں جیسا بعض جوشیلے لوگ ایک ہی طرف چل دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی کا جواب لاجواب

سو میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے تو ایک جاہل شاہ صاحب کی بات بھی ماننا پڑے گی جو نماز نہ پڑھتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے

(۱) تیرے پاس مال ہے نہ گھوڑا کہ جو تو ہدیہ کرسکے تو کم از کم زبانی دعاء ہی دیدے۔

ولذکر اللّٰہ اکبر تو بس کہنے لگے کہ اب ہم اللہ اللہ ہی کیا کریں گے۔ نہ نماز کی ضرورت رہی نہ روزہ کی میں نے کہا کسی کام کے بڑا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اور چھوٹے کاموں سے پہلو تہی کرلو۔ دیکھو تمہارے تین بیٹوں میں سے ایک اگر زیادہ کام کا ہے تو کیا دو کا گلا گھونٹ دو گے ہرگز نہیں پس ولذکر اللّٰہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ اس سے قرآن و نماز کی فضیلت ثابت کی گئی ہے لانہ ذکر اللّٰہ اس لئے کہ یہ بھی ذکر اللہ ہیں ولذکر اللّٰہ اکبر اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے تو نماز بہت بڑی چیز ہوئی بس اب آگے شاہ صاحب کے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی کیونکہ اب تو اس کی تفسیر میں دو احتمال ہوگئے ایک یہ کہ ذکر اللہ سے مراد نماز ہی ہو جیسا اُپر ذکر ہوا دوسرے یہ کہ محض ذکر متعارف یعنی اللہ اللہ کرنا مراد ہو اب ذکر اللہ سے مراد جزماً صرف اللہ اللہ ہی کرنا نہیں رہا بلکہ اس میں نماز کا احتمال بھی پیدا ہوگیا اور دوسرے دلائل سے یہ صرف احتمال ہی نہیں رہا بلکہ واقع میں بھی ایسا ہی ہے۔

دعاء سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

اسی طرح دعا کے متعلق بعضوں کو ایسی ہی غلطی ہو رہی ہے سو اس کو بھی سمجھو اس کے بڑا ہونے کے معنی بھی یہی ہیں کہ اور تدابیر سے مانع نہیں ہے(۱) کیونکہ دعا میں وہ تدابیر بھی داخل ہیں ایک دعائے قولی ہے ایک دعائے فعلی ہے اور اگر واقع میں یہی معنی ہیں جو تم سمجھتے ہو تو پھر نکاح بھی نہ کرو اور کہدو ہم کو شاہ صاحب کی دعا پر اعتماد ہے۔ اولاد کی تو ہمیں بڑی تمنا ہے مگر نکاح نہیں کریں گے بس یوں ہی کسی طرح دعا سے اولاد ہو جاوے گی۔ کیونکہ اگر نکاح سے اولاد ہوئی تو پھر خدا کی قدرت ہی کیا ہوئی۔ صاحب اپنے دعا کے بھروسے کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے۔ جب نکاح میں ایسا نہیں کیا تو اس معاملہ میں ایسا کیوں کرتے ہو۔ پس

(۱) دوسری تدبیروں کو منع نہیں کرتی۔

اب دعا کے یہ معنی ہوئے کہ جتنی تدبیریں ہوسکیں سب کرو اور پھر دعا بھی کرو اور محض تدبیر پر بھروسہ نہ کرو بھروسہ دعا ہی پر کرو اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر بآواز بلند بر توکل زانوئے اشتر بہ بند (۱)
گر توکل میکنی در کارکن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن (۲)

یہ مضمون مذکور حدیث شریف کا ہے کہ ایک اعرابی نے پوچھا جناب رسول مقبول ﷺ سے کہ اونٹ باندھ کر توکل کروں یا خدا کے بھروسہ پر کھلا رہنے دوں۔ آپ نے فرمایا اعقل ثم توکل کہ باندھ پھر خدا پر بھروسہ کر۔ تو یہ ہے توکل اب اس میں رسی پر نظر کرنا الحاد اور بے دینی ہے اور محض خدا کے بھروسہ پر اسباب کا قطع کرنا حماقت وجہل ہے اور دونوں کا جمع کرنا عقل اور توکل ہے۔

یہ ہے حقیقت توکل کی اب خلاصہ وعظ کا ذکر کر کے ختم کرتا ہوں وہ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جہاں دنیا کی مذمت اور آخرت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اُس سے مقصود یہ ہے کہ اپنی آخرت کی فکر کرو اور آخرت کی فکر یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی اور اپنے بھائیوں کی سب کی اصلاح کرو اب میں ختم کرتا ہوں حق تعالیٰ سے دعا فرمائے کہ وہ ہمیں فہم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔ (۳)

وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بآواز بلند یہ بات کہی ہے کہ پہلے اونٹ باندھ دو پھر توکل کرو (۲) اگر توکل کرنا ہی ہے تو تدبیر کرو لیکن اس پر بھروسہ نہ کرو بھروسہ اللہ قادر مطلق پر کرو (۳) اللہ تعالیٰ وعظ میں مذکور تمام باتوں سے سب پڑھنے والوں کو مستفید فرمائے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

یکم ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ